رقصِ بسمل

(افسانوی مجموعہ)

(نظرثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن)

شہزادہ بسمل

رقصِ بسمل

(افسانوی مجموعہ)

(نظرِ ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن)

رقصِ بسمل کی مرے دل کو ادا بھی آئے
مجھ سے بچھڑو تو تڑپنے کا مزا بھی آئے

------------------- جاوید نسیمی

رقصِ بسمل

(افسانوی مجموعہ)

(نظرثانی واضافہ شدہ ایڈیشن)

شہزادہ بسملؔ

تبسّم پبلی کیشنز

A/1-115 محلہ ابراھیم، بمنہ، سرینگر-190018

نام کتاب	:	رقصِ بسمل (افسانوی مجموعہ)
مصنف	:	شہزادہ بسمل (9419475995, 8494061671)
صفحات	:	88 (سائز:23x36/16)
باراوّل	:	1985ء (تعداد: پانچ سو)
باردوم	:	1985ء (تعداد:20ہزار)
بارسوم	:	1986ء (تعداد:ایک ہزار)
بارچہارم	:	2018ء (تعداد:ایک ہزار)
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	**TFCسنٹر** گاؤکدل سرینگر#9419525103
طباعت	:	**الحیات** پرنٹوگرافرس سرینگر9906662404
قیمت	:	100روپے

Raqs-e-Bismil

(Urdu Short Stories)

by

Shahzada Bismil

ناشر

تبسّم پبلی کیشنز

A/1-115 محلہ ابراہیم، بمنہ، سرینگر-190018

9419475995, 8494061671



اِنتساب

اپنی والدہ مرحومہ کے نام
جو اَب بھی
خوابوں میں آکر
مجھے تسلیاں دیا کرتی ہیں

کچھ اس مجموعے کے بارے میں

از ------------------------ پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین

رقصِ بسمل شہزادہ بسمل کے سات افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے یہ کہانیاں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ''خزان کا پھول'' میں ایک ایسی معصوم لڑکی کی کہانی پیش کی گئی ہے جس کے غریب والدین اپنی مالی حالت اور مجبوریوں کی وجہ سے اُس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے کردیتے ہیں جو عمر میں اُس سے بہت ہی چھوٹا تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ اُس کا خاوند لگنے کی بجائے اُس کا بچہ دکھائی دیتا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اُس کی غربت اُس کے سارے ارمانوں کو مسل کر رکھ دیتی ہے۔

''انگارے'' میں گاؤں کی ایک معصوم دوشیزہ اوشا گاؤں کے ایک دولت مند لالہ کے نوجوان بیٹے کی ہوس کا شکار ہونے پر ندی میں ڈوب کر خودکشی کرتی ہے۔ ''خاندان کی ناک'' شہر کی ایک ایسی دوشیزہ کی کہانی ہے جس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف گاؤں کے ایک دولت مند خاندان میں کردی جاتی ہے۔ سُسرال والوں کے خلوص کے باوجود اُس ماحول میں وہ خود کو ایڈجسٹ نہیں کرپاتی اور رہ رہ کر اپنے محبوب کی یاد اُس کو ستاتی رہتی ہے۔ ہر وقت یہ نفسیاتی کشمکش بالآخر اُس کو دق کا شکار کر کے موت کے آغوش میں سُلا دیتی ہے۔

رقصِ بسمل بھی ایک ایسی ہی دوشیزہ کی کہانی ہے جو اپنے بے وفا محبوب کا

انتظار کرتے کرتے ہسپتال میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔

انٹرویو میں اُس ڈھونگ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمارے اس دور میں ملازمتوں کے سلسلہ میں ہر جگہ رچایا جاتا ہے اور ملازمتیں صلاحیت کی بجائے سفارشی خطوط کو مدنظر رکھ کر بانٹی جاتی ہیں۔

''اگلی بہار میں'' بھی ایک نہایت ہی تلخ حقیقت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ جو لوگ کشمیر جیسے صحت افزا مقامات کو تفریح گاہ کے علاوہ عیاشی کا اڈہ اور وقتی دلچسپی کا مرکز خیال کرتے ہیں اُن کے لیے کہانی میں ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ معصوم جوانیوں کو پیار کا جھانسہ دے کر اُن کی زندگی سے کھلواڑ کرنا اور وعدہ کر کے لوٹ کر کبھی نہ آنا اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔

''اور وہ ناچ رہی تھی'' میں ایک بار پھر ہم ایک معصوم الہڑ دوشیزہ جو حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر طوائف بن جاتی ہے کو ایک ہوس پرست کی نفسیاتی خواہشات کا شکار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جو بالآخر اپنی اُس ذلت کا انتقام اس طرح سے لیتی ہے کہ قارئین لرز جاتے ہیں۔

اوپر پیش کئے گئے موضوعاتی جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فنکار نے سماج کے مظلوم طبقے کی آواز کو اُبھا کر غور و خوض کرنے کی ترغیب دینا چاہی ہے۔ ان کہانیوں میں پیش کئے گئے مسائل نئے نہ ہوتے ہوئے بھی اس لیے نئے اور اہم لگتے ہیں کہ یہ انسانی زندگی اور انسانی نظام حیات کے ہر دور کی ٹھوس سچائیاں ہیں اور انہیں پڑھتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ ظالم و مظلوم کی پُرانی کہانی ہے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ پُرانی کہانی ایک بار پھر دہرائی جا رہی ہے اور یہ بھی کہ ہم خود بھی ان کہانیوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں۔ ان کہانیوں کی عصری معنویت ہی دراصل ان کی اہمیت کا سب

سے بڑا ثبوت ہے۔

ان کہانیوں کے موضوعات دیکھتے ہوئے ایک اور بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر پر عورت پر ہونے والے مظالم کو پیش کیا گیا ہے۔ ہمارا دور اور اس دور کی انسانی زندگی بہت ہی پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہے۔ آج کا کوئی بھی کہانی کار اگر وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہ اُن سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ بسمل نے ان کہانیوں میں کچھ مسائل کی طرف اشارے تو ضرور کئے ہیں مگر اس طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں وہ ان پیچیدہ مسائل پر بھی قلم اُٹھائیں گے۔

فنی اعتبار سے بھی یہ کہانیاں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ خوش آیند پہلو تو یہ ہے کہ فنکار نہ صرف کہانی کہنے کے فن سے واقف ہے بلکہ ماضی میں ہوئے مختلف تجربات اور اُن کے اسالیب سے بھی وہ روشناس ہیں۔ اس لیے کہیں تو وہ بیانیہ اسلوب اختیار کرتے ہیں تو کہیں ڈرامائی، کہیں وہ خطوط نگاری کے اسلوب کو برتتے ہیں تو کہیں نقاد اور تبصرہ نگار کے تجرباتی اور تحلیلی انداز کو____

اگرچہ ان کہانیوں میں ان تجربات کی ابتدائی صورت ہی دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ اگر یہ مشق جاری رہتی ہے تو جلد ہی مصنف کی وساطت سے ہمیں اچھی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ خدا کرے ہماری توقعات پوری ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین
شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی

دوسری بات

(نظرثانی واضافہ شدہ 2018 ایڈیشن کے حوالے سے چند باتیں)

زیرنظر کتاب جب پہلی بار چھپ کر آ گئی تو اسے ڈائریکٹر سکول ایجوکیشن جموں نے بابت مالی سال 86-1985 محکمہ تعلیم جموں کے لیے منظور کیا، جس وجہ سے کتاب کو دوبارہ (20,000 کی تعداد میں) چھاپ کر صوبہ جموں کے متعلقہ چھ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسران کو فی کس 3000 کاپیوں کے حساب سے کتاب سپلائی کرنا پڑی۔ اُن دنوں صوبہ جموں کے فقط چھ ہی اضلاع ہوا کرتے تھے۔

راقم اُن دنوں جموں میں تھا اور پھر سن ۱۹۸۸ء میں جب میرا تبادلہ کشمیر کے لیے ہوا تو لوٹتے وقت ایک ہینڈ بیگ جس میں کتاب کا مسودہ کچھ دیگر کتابیں اور کاغذات تھے، سفر کے دوران یا تو گاڑی کے چھت سے گر پڑا یا کسی نے چُرا لیا۔ بات آئی گئی ہو گئی ـــــــــ

ابھی حال ہی میں جب ہم نے اپنا پُرانا سیلاب رسیدہ مکان منہدم کیا تو پُرانے سامان میں کتاب کے دو نسخے بھی برآمد ہوئے جو گرچہ اچھی حالت

میں نہیں تھے مگر پھر بھی پڑھے جا سکتے تھے۔ میرا اُسی وقت خیال بنا کہ پُرانے متن میں کچھ اضافہ کر کے کتاب پھر سے چھاپ کرنی چاہیے۔ اس طرح سے میں نے اس میں مزید تین کہانیوں کا اضافہ کیا ہے۔ لیجئے کتاب حاضر خدمت ہے۔ اسے پڑھیئے اور پڑھ کر اپنی قیمتی رائے سے بھی نوازیئے۔

میں منتظر رہوں گا۔

سرینگر
۳ر مئی ۲۰۱۸ء

شہزادہ بسمل

پہلی بات

کہانیوں کے اس مجموعے کو آج سے کچھ عرصہ قبل ہی منظر عام پر آنا چاہیے تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دی جاسکی۔

میں اپنے دوست اندو بھوشن کا بے حد مشکور ہوں جن کے تعاون اور وساطت سے یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچ سکا ہے۔ وہ نہ صرف میرے پیچھے لگے رہے بلکہ انہوں نے گویا مجھے چند کہانیوں کو مجموعہ کی صورت دینے کے لیے مجبور کیا۔

میں ڈاکٹر ظہور الدین صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس مجموعے پر تبصرہ فرمایا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

میں محترم دیوداس جی کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے کتاب کا سرورق بنانے کی زحمت اٹھائی۔

اگلا مجموعہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں دینے سے قبل اُن کی قیمتی رائے کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔

جموں توی　　　　　　　　　　شہزادہ بسمل

۲۵ر جنوری ۱۹۸۵ء

خزاں کا پھول

نالہ کرنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے
(سعیدالنساء حرماں)

خزاں کا پھول

میں نے کھیتوں کی آخری منڈیر پھلانگی اب میں گاؤں کے بالکل قریب تھا۔ دور سے مجھے ایک جنازہ آتے ہوئے دکھائی دیا۔ پاس پہنچنے پر میں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

''بھئی کس کا جنازہ ہے یہ کون مر گیا''۔

''کریم بٹ کی بیٹی حاجرہ مر گئی کیا تمہیں معلوم نہیں''۔

میں دم بخود رہ گیا۔ دلی افسوس ہوا______

سوچیں بہت دور نکل گئیں۔ کچھ دیر تک ادھیڑ و بُن میں رہنے کے بعد حواس جب درست ہوئے تو میں نے دیکھا کہ جنازہ کافی آگے نکل چکا تھا اور پگڈنڈی سے اُٹھنے والی دھول نے بیچ میں ایک پردہ سا حائل کر دیا تھا۔ میرے قدم خود بخود قبرستان کی طرف اُٹھنے لگے۔

میت کو زمین کے سپرد کیا گیا۔ حاجرہ کے پھول جیسے نازک بدن پر منوں مٹی ڈالی گئی اور وہ اُسی کے نیچے سوگئی______ کھوگئی______ اب وہ کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ اب اُسے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔

کچھ باتیں یاد ہی نہیں آتیں۔ کچھ یاد کر کے بھی یاد نہیں آتیں اور کچھ رہ رہ کر یاد آتیں ہیں۔ یاد اور فراموش کا یہ سلسلہ بہت پُرانا ہے۔

دو سال پیشتر میں اُس گاؤں میں تھا اور میرا وہاں پر وہ دوسرا دن تھا۔ میں ایک خوبانی کے پیڑ کے نیچے ہاتھوں میں ایک کتاب لئے بظاہر مطالعہ میں مشغول تھا مگر میرے خیالات نہ جانے کن دشاؤں میں بھٹک رہے تھے۔

''ہُودی''______ کی آواز پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے

دیکھا سامنے پگڈنڈی پر ایک پری روچہرہ، گاؤں کے روایتی حُسن سے بھرپور، مخمور آنکھوں والی ایک لڑکی گائے کو ہانک کرلے جارہی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی چھڑی سے گائے کو ہولے ہولے مارتی گئی، مجھ سے دور ہوتی گئی یہاں تک کہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ دیر تک اُس کے حسین خدوخال میری آنکھوں کے سامنے محور قصاں رہے۔

اگلے دن میں اُسی وقت اُسی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ آئی اور لطیف ہوا کے جھونکے کی طرح میرے سامنے سے گذر گئی اور میں دیکھتا ہی رہ گیا_____ میں دیکھتا ہی رہ گیا اور دور بہت دور جا کر جب اُس نے غیر اختیاری طور پر مڑ کر دیکھا تو نہ جانے کیا سمجھ کر میں بھی اُسی راستے پر ہولیا۔ قریب پہنچنے پر جب میں نے بات کرنے کے لیے مُنہ کھولا تو الفاظ ملکوتی حُسن کی آنچ کے سامنے پگھل کر بہہ گئے۔ میں کوئی بات نہ کرسکا۔ کرنے کی کوشش کی، مگر زبان گنگ ہوکے رہ گئی۔ نہ جانے یہ حُسن اتنا ظالم کیوں ہوتا ہے۔

میرے میزبانوں کے گھر میں شادی ہونے والی تھی۔ اگلے دو تین مصروفیت میں گذر گئے۔ شادی میں، میں نے گرچہ اُس کی ایک جھلک ضرور دیکھی مگر قریب جانا ممکن نہ ہوسکا۔ یوں ملنے اور بات کرنے کی خواہش تشنہ طلب ہی رہی۔

ایک دن جب میں یونہی بے مقصد گھوم رہا تھا میں نے اُس کو ایک بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے کشمیری زبان میں گانا گاتے ہوئے پایا جس کے بولوں کا مطلب کچھ اس طرح سے تھا:

”میں نے پینے کے لیے پیالہ ہاتھ میں لیا تھا مگر شومیٔ قسمت سے میرے ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوا اور پیالہ چھلک پڑا۔ پیئے بنا ہی میرا پیالہ خالی

ہو گیا''۔

اُس کی آواز میں درد و کرب تھا۔ تڑپ اور آہ وزاری تھی۔ میں اپنے آپ سے بے خبر اُس کی درد بھری مگر میٹھی آواز میں کھو گیا____ وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی____ دور کوئی گھوڑا ہنہنایا____ میں جاگا____ وہ چونک پڑی____ گیت تھم گیا____ سحر ٹوٹا____ وقت نے سانس لی۔ اُسے میری موجودگی کا علم ہو گیا۔ ہماری نگاہیں جب چار ہوئیں میں نے دیکھا کہ اُس کے بہنے والے آنسوؤں نے اُس کے چہرے پر دو لکیریں سی بنائی تھیں۔ وہ آنسو پونچھنے لگی میں ہونقوں کی طرح بس اُسے دیکھتا ہی رہا۔ وہ مُڑی اور آنکھیں چُرا کر آگے بڑھنے لگی۔ میں پیچھے لپکا____

''سنیے۔ حق تو نہیں بنتا مگر کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ رو کیوں رہی تھی''۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اب جو غور سے اُس کے سراپا جائزہ لیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے سرخ اُجلے چہرے کے پس منظر میں پیلاہٹ کی ایک دبیز تہہ بھی موجود تھی۔ رنگوں کا یہ امتزاج دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک طرف گلاب کی ڈالیاں جھوم رہی تھیں اور دوسری جانب سرسوں کے کھیت محو رقصاں تھے۔ وہ بیک وقت بہار کی کلی بھی تھی اور خزاں کا پھول بھی۔

میں اسی ادھیڑ و بُن میں نہ جانے کیا سوچنے لگا اور پھر جب میں نے نظریں اٹھا کر اُسے پھر دیکھنا چاہا وہ گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ میں فقط بس اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور بالآخر میں بھی اُسی پگڈنڈی پر ہولیا____ مغموم سا____

سوچوں کے اتھاہ سمندر میں غرق ________

ایک دن پھر اُس کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی۔ میری جھجک کافی حد تک دور ہوچکی تھی۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھ لیا۔

''کیا آپ کا نام جان سکتا ہوں''۔

''ناموں میں کیا رکھا ہے اور پھر کیا کیجئے گا نام جان کر''۔ اُس نے بے رُخی کے ساتھ جواب دیا۔

''دیکھئے میں شہر سے آیا ہوں۔ آپ کا مہمان ہوں۔ مجھے کل پرسوں ہی شہر واپس جانا ہے۔ اتنی بے رُخی ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دو پل میرے ساتھ بات کرنے میں کیا حرج ہے جب کہ میرا مطالبہ بھی کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں''۔

وہ میری باتوں سے کچھ متاثر ہوئی اور پھر تڑ سے بولی۔

''ہاں میں بے شک پڑھی لکھی ہوں۔ اچھا تو پوچھیے کیا پوچھنا ہے آپ کو''۔

اس سے پہلے کہ میں بات آگے بڑھاتا ایک چھ سات سالہ لڑکا اُس کی طرف دوڑتا ہوا آیا۔

''حاجرہ۔ حاجرہ۔ دیکھو میں نے کتنی بڑی تتلی پکڑی ہے''۔

''ہاں بہت بڑی ہے اِسے مارنا نہیں جا چھوڑ آ اِسے کہیں جھاڑی میں''۔

لڑکا جدھر سے آیا تھا اُسی طرف چلا گیا۔ اُس نے میری موجودگی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ویسے بھی دیہاتی بچے بھولے بھالے ہی ہوتے ہیں۔

''اچھا تو گویا آپ کا نام حاجرہ ہے''۔

جی ہاں! یہی میرا نام ہے اور جو لڑکا ابھی آیا تھا وہ میرا ________

جملہ اُس کے گلے میں اٹک گیا۔ ذرا سا کھنکار کر اور ایک نحیف مردہ لہجے میں بولی ــــــ

''وہ میرا خاوند ہے''۔

''جی ــــــ یعنی ــــــ آپ کا شوہر ــــــ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ــــــ اُو ــــــ نُو ــــــ''

''ایک ہی بات ہے۔ پچھلے سال میری اُس کے ساتھ شادی ہوگئی۔ میرے بابا کو بیلوں کی جوڑی خریدنے کے لیے پیسہ چاہیے تھا اور اُس کے بابا کو ایک نوکرانی کی ضرورت تھی۔ سو معاملہ باہمی طور پر طے ہوگیا''۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کو بیچا گیا۔ آپ کی معصوم اُمنگوں اور ارمانوں کا سودا کیا گیا''۔

مجھے نہ جانے کیوں اور کس لئے اس سودے پر غصہ آرہا تھا۔ شاید صنف نازک کی بے بسی اور کمزوری کے احساس کی وجہ سے۔ زمانہ کوئی بھی ہو عورت کا استحصال ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

''سودا بازی گاؤں میں تو کیا شہروں میں بھی ہوتی ہے۔ رہے جذبات اور ولولے اُن پر سوچنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے خصوصاً معاملہ جب مطلب برآری کا ہو۔ کسی کو کسی کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی فکر بھلا کیوں ہونے لگی۔ خود غرضی کا زمانہ ہے۔ سب کو اپنے مطلب سے غرض ہے۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ جب تک وہ جوان ہوجائے گا میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہوں گی۔ اب یہ کسے پتہ میں تب تک جیوں گی بھی یا نہیں''۔

اُس کی آنکھوں سے دو گرم گرم چشمے اُبل پڑے جو اپنے ساتھ تمام آرزوؤں، اُمنگوں اور ارمانوں کی حسین دنیا بہا کر لے گئے اور میں دور آسمان

کی نیلا بٹوں کو گھورتا رہ گیا اور اس سوال کا جواب تلاشتا رہا کہ کب ______

کب نہ صرف اپنی ریاست سے بلکہ سارے برصغیر ہندو پاک سے یہ گوڑ یالگن، بال وِواہ یا چھوٹے بڑے کی غیر فطری بچپن کی شادی کی وبا اور بدعت نابود ہوگی۔ کب لڑکی کو بے زبان گائے اور مرد سے کمتر نہ سمجھا جائے گا۔ لوگوں میں صحت مند سوچ پیدا ہوگی۔ کب حُسن اپنا مقام پائے گا اور کب عشق راج کرے گا۔ کب حسین و مہ جبین دھول مٹی میں نہ ملیں گے اور کب صورتیں وقت سے پہلے خاک میں پنہاں نہ ہوں گی۔ کب ہمارا ان پڑھ جاہل طبقہ خود غرضی کے حصار سے نکل کر فہم وادراک کی دنیا میں قدم رکھے گا۔ اور کب ذاتی مطلب کی خاطر جذبات کچلے نہ جائیں گے، ارمان مٹی میں نہ ملائیں جائیں گے۔ جوانیوں کے سودے نہ کئے جائیں گے۔ حُسن پامال ہوگا اور نہ عشق پا بہ جولاں ہوگا۔ کب ارمانوں کے جنازے اٹھیں گے اور نہ امنگیں دھول مٹی چاٹے گی اور کب کائنات کی محترم مگر بے زبان ہستی کو مقہور و مصلوب نہ ہو کر اپنا جائز حق ملے گا۔ کب ______ آخر کب ______



رقصِ بسمل

میرے زخمِ تمنا نے لہو دینے کی ٹھانی ہے
رچانے اپنے ہاتھوں میں حنا کیا تم نہ آؤ گے
(شفیق ڈھاکر)

رقصِ بسمل

خزاں کے دن تھے میں فرن پہنے اور کانگڑی لیے کھڑکی کے پاس بیٹھا چناروں سے گرتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ مایوس کُن رنگ اور زرد فرش دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے وہ سینکڑوں انسان مرد عورت، بچے بوڑھے پھرنے لگے جن کے ساتھ میں نے کچھ وقت گذارا تھا۔ اُن میں سے کچھ کو صحت یابی کے بعد ہنستے مسکراتے وداع کیا تھا اور کئی ایک کو شکست دل کے ساتھ منہ پر چادر ڈال دی تھی۔ پیلے سوکھے جسم ____ ہڈیوں کے پنجر ____ اُترے چہرے ____ گنی جانے والی پسلیاں ____ کھانسنے کا شور ____ تھوکنے کی ناگوار آوازیں ____ کریہہ ماحول ____ ہر طرف آہ و فغاں ____ درد کی کسک ____ مرض کی اینٹھن ____ ڈوبتی ٹوتی سانسیں ____ آکسیجن سے بھرے سیلنڈر ____ اسٹریچر ____ ڈاکٹر ____ نرسیں ____ آہنی بیڈ ____ سفید کوٹ ____ لال کمبل ____ کئی چہرے ____ کئی شکلیں ____ کئی رنگ ____ یہ ساری چیزیں میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کے پردے کی طرح گھومنے لگیں۔ چناروں سے گرنے والے پتوں میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

بہت دن ہوئے۔ ایک کافی لمبا عرصہ گذر گیا۔ کچھ باتیں ذہن میں ایک طرف سے آکر دوسری طرف سے نکل جاتی ہیں۔ مگر کچھ باتیں ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں جن کو زمانے کے سرد و گرم اور وقت کے حادثات مٹانے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یادیں ایک الہڑ دوشیزہ کی

طرح ہوتی ہیں جو ایک جگہ ٹکتی نہیں، آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یادیں بڑی کڑوی، کسیلی اور کٹیلی ہوتی ہیں۔ گیلی لکڑی کا وہ دھواں جو لکڑی کو نہ جلاتا ہے اور نہ بجھنے دیتا ہے۔ درد کی وہ چُبھن جو انسانی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے اور برف کے تودے کی طرح آہستہ آہستہ پگھلاتی رہتی ہے۔ یادوں کا کنول ہمیشہ آنسوؤں کے تالابوں میں ہی کھلتا ہے۔ یادیں ہمیشہ دُکھ سے اٹی، غم سے پٹی اور درد سے چھِدی ہوتی ہیں۔

اُن دنوں میری ڈیوٹی سینی ٹوریم میں تھی۔ میں نے ماں کے دودھ کے ساتھ ہی انسانی ہمدردی اور خدمت کا جذبہ پی رکھا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے بے نور کھوکھلی آنکھوں، زرد چہروں، سوکھے جسموں اور پژمردہ انسانی پنجروں سے کوئی خوف نہیں آتا تھا بلکہ انسانی سماج کے اس غمناک یرقان زدہ کمزور اور لاغر طبقے کے ساتھ ہمدردی، دلبری و دلجوئی کرنے میں ایک ذہنی سکون ملتا تھا۔

سینی ٹوریم دور ایک کھلی جگہ پر پہاڑی کے دامن میں سروشمشاد کے درختوں کے بیچ ایک پُرسکون ماحول میں واقع تھا۔ خوبصورت اور دلفریب سبزہ زاروں میں لوگوں کے نظروں سے پوشیدہ بید مجنوں کے سایوں جیسے نہرو پارک کی پُشت پر درختوں کے بیچ ایک ہاؤس بوٹ ــــــ سمادھی پر آنکھیں موند سے بیٹھا ایک سنیاسی۔ وہ جگہ رومانی ہونے کے باوجود بھی مرجع خلایق نہیں تھی کیونکہ چھوت کے خوف سے لوگ اُس طرف کم ہی آتے تھے۔

ایک رات کا واقعہ ہے۔ یہی خزاں کے دن تھے۔ درختوں کے بیچ سے چاندنی کی کرنیں چھن چھن کر سینی ٹوریم کے ہرے رنگ والے چھت پر آکر اٹھکیلیاں کررہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ چاند سونے کی افشاں چھڑک رہا ہے اور اس الف لیلوی ماحول میں ہسپتال کی عمارت ایک میٹھی اور گہری نیند کا خواب

لگ رہی تھی گرچہ عمارت کے مکین کربِ مسلسل کے ساتھ نبرد آزما تھے۔

"آہ" ____ وہ پھر کراہنے لگی۔ اور اُس کی آواز سے سارے وارڈ میں ایک گونج سی پیدا ہوگئی۔

اُس رات وارڈ نمبر ۲ اور بیڈ نمبر ۸ کی مریضہ کی حالت کبھی سنبھلتی تھی اور کبھی بگڑتی تھی مگر اُس دن اُس کے سینے میں درد کی ٹیس بار بار اُبھر رہی تھی اور ہمیں فوراً اُس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا تھا۔ باقی تمام مریض اپنے اپنے بستروں میں دُبکے بیٹھے کچھ اونگھ رہے تھے، کچھ سو رہے تھے اور کچھ اپنے درد کو سہلا رہے تھے۔ وارڈ میں کلاک نے جب ساڑھے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ الارم کی آواز دیر تک وارڈ میں گونجتی رہی۔ وہ بار بار کراہ رہی تھی اور نرس اُس کی کلائی تھامے اُس کے نبض کی حرکات نوٹ کر رہی تھی۔

"سلیم" ____ وہ بڑبڑانے لگی۔

"سلیم ____ اب آؤ نا۔ آتے کیوں نہیں۔ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں ____ "۔

رُک رُک کر۔ ٹھہر ٹھہر کر اُس کے منہ سے الفاظ نکل رہے تھے۔ لگ رہا تھا وہ کہیں دور سے بول رہی ہے۔ میں قریب ہی سٹول پر بیٹھا اُس کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ دور کسی پیڑ پر بیٹھا الو چیخا۔ مضبوط اعصاب رکھنے کے باوجود بھی مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہوگیا۔ وہ پھر بولنے لگی۔

"سلیم میں نے بہت انتظار کیا۔ اب اور انتظار کرنے کی ____ مجھ میں ____ ہمت نہیں رہی ____ تم نے مجھے ____ انتظار کرنے کو ____ کہا تھا ____ تم آؤ گے ____ اور اپنی ____ دلہن

بنا کر ____ مجھے اپنے گھر ____ اپنے گاؤں ____ اپنی دنیا ____ میں لے جاؤ گے ____ اور انتظار نہیں ہوتا ____ میں ____ تھک چکی ہوں ____ تم آتے ____ کیوں نہیں ____ اب ____ آؤ نا ____ سلیم ____ خدا کے لیے۔

اُس کی آواز میں ایک التجا، ایک پکار، ایک درد تھا۔ وہ آواز کتنی پُرسوز اور کرب آمیز تھی وہ سننے والا ہی جان سکتا تھا۔ نرس کے انجکشن دینے سے کچھ دیر خاموشی رہی۔ سناٹا ہو گیا ____ مکمل سکوت۔ مگر اُس خاموشی میں کلاک کی ٹک ٹک زندگی کا احساس دلاتی تھی۔ مریضہ ایک بار پھر اُسی انداز میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"میں نے ____ شادی کا جوڑا ____ پہن رکھا ہے ____ پیارے سلیم ____ میرے ____ اچھے سلیم ____ مگر ____ تم آتے ____ کیوں نہیں ____ س ____ س ____ س ل ____ ی م"۔

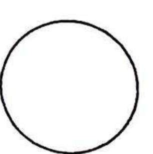
اُس کو خون کی ایک قے ہو گئی جس سے سفید سفید اُجلا تکیہ لالہ زار بن گیا۔ اور وہ کھو گئی ____ سو گئی ایک میٹھی اور لمبی نیند۔ اب اُس کو جگایا نہیں جا سکتا۔ اب وہ اُس گاؤں کے شریف زادے کو پکارنے سے قاصر تھی جو مرنے والی کے گھر میں پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتا رہا، پڑھتا رہا، اپنا کیرئیر بناتا رہا اور مریضہ کو جھوٹے سپنوں کی دنیا کی سیر کراتا رہا۔ سلیم خود اپنے رنگین سپنوں میں کھو گیا۔ اور مریضہ وعدے پر اعتبار کئے بیٹھی اُس کا انتظار کرتی رہی اور اپنے رنگین سپنے بُنتی رہی۔ مرنے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر

ایک مسکراہٹ تھی اور چہرے پر دلہنوں جیسی شرماہٹ والی اُس مریضہ کے ہونٹ اپنے ہی خون سے رنگے ہوئے تھے۔

ہسپتال کا نیا سپرانٹنڈنٹ ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اُدھر سے مریضہ کی لاش نیچے لائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو یہ صورت حال بدشگونی لگی۔ اتفاقاً مریضہ کی والدہ نے ڈاکٹر صاحب کو اُس افراتفری کے ماحول میں دیکھا اور پہچان کر اُسے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"سلیم ـــــ زرینہ مرتے دم تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی"۔





دُھندلکا

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
(داغؔ دہلوی)

دُھندلکا

زندگی کے تیس برس کہاں کھو گئے اور کیسے گذر گئے۔ اس بات کا احساس اکبرؔ صاحب کو کبھی نہ ہوا۔ کیونکہ زندگی کی تمام راحتیں میسر ہونے اور آسودہ حالی کے سبب اُنہیں دیگر باتوں کی طرف دھیان دینے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ گھر میں پیسے کی فراوانی، تابعدار بچے، فرمانبردار بیوی کے علاوہ رہنے کے لیے ایک خوبصورت بنگلہ تھا اس لیے اُنہیں زندگی کے تیس سال بیت جانے کا کبھی احساس ہی نہ ہوا۔

اُس گاؤں میں وہ پہلے بھی ایک بار آ چکے تھے اور گاؤں میں ڈاک بنگلہ بنانے کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ گاؤں میں قیام کے دوران گاؤں کی ایک بھولی بھالی مگر یتیم لڑکی ساجدہ کو دیکھتے ہی انہوں نے اور اُن کو دیکھ کر ساجدہ نے محسوس کیا کہ وہ شاید ایک دوسرے کے لیے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ کام کے دوران ایک بار اکبرؔ صاحب کو اپنے ہیڈ آفس کام کی رپورٹ دینے کے لیے جانا پڑا مگر وہ ساجدہؔ کے لیے مختلف سوغات لے کر جلد ہی واپس لوٹے کیونکہ وہ ساجدہ کی جدائی یا دوری برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

وقت بھاگتا گیا ____

ڈاک بنگلے میں اینٹ پر اینٹ بیٹھتی گئی اور اُن دونوں کی محبت بھی پروان چڑھتی رہی حتیٰ کہ وہ وقت بھی آیا کہ ڈاک بنگلے کی تعمیر مکمل ہو گئی اور اکبر صاحب نے بہ مجبوری شہر واپس لوٹنے کی تیاری کر لی۔ انہوں نے بہر حال ساجدہ سے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد لوٹ کر آئیں گے اور ساجدہ کو اپنے ساتھ اپنی دلہن بنا کر شہر لے جائیں گے اور اگر کوئی گھریلو اڑچن پیدا ہو گئی تو وہ شہر

چھوڑ کر گاؤں میں ہی رہنے کے لیے آجائیں گے۔ دل پر پتھر رکھ کر ساجدہ خوش آیند سپنوں میں کھوگئی۔

اکبر صاحب شہر جا کر شہری ماحول میں کھو گئے۔ شہر کی دلچسپیوں اور دلفریبیوں نے اُنہیں اپنے آپ میں مدغم کرلیا۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ انہوں نے کسی سے کوئی عقدہ کیا ہے۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔ ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے اور پیسہ بناتے گئے۔ چھوٹی سی ورک سپروائزر کی پوسٹ سے ایک بڑی پوسٹ پر آگئے۔ اُن کی شادی ایک متمول گھرانے میں ہوگئی۔ گھر بن گیا، بچے ہوئے، مگر اس بات کو وہ یکسر فراموش کر گئے کہ کوئی اُن کے انتظار میں گاؤں میں تالاب کے کنارے ہر دن اُن کی راہ دیکھا کرتا ہے اُن کے انتظار کے ساتھ دہائیاں بھی دے رہا ہے۔

کتیو چھک نندہ بانے   ولو معشوقہ میانے

(کہاں ہو میرے دلبر میرے محبوب اب لوٹ کر آ بھی جا)۔

اُس علاقے میں جب اکبر صاحب انجینئر کی حیثیت میں تعمیراتی پروجیکٹ کے کام کی نگرانی کے لیے مامور ہوئے تو انہیں ساجدہ کا خیال ضرور آیا مگر اپنی موجودہ پوزیشن کو مدنظر رکھ کر انہوں نے گھڑے مُردے اُکھاڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے سوچا اگر میں ساجدہ کے بارے میں کوئی پوچھ تاچھ کروں گا تو لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے اور میرے بارے میں کیا کیا باتیں مشہور کریں گے جس سے بے عزت ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لیے اپنی پوزیشن کا خیال کرتے ہی انہوں نے ساجدہ کے بارے میں کوئی پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ جان کر اس خیال کو ہی ذہن سے جھٹک دیا۔

دنیا کا کاروبار چلتا رہا ______

ایک رات اکبر صاحب ڈاک بنگلے کے کمرے میں جاگ رہے تھے۔ حد سے زیادہ الجھن اور پریشانی کے باعث اُنہیں کسی پل قرار نہیں مل رہا تھا۔ وہ کمرے کے چکر کاٹ رہے تھے۔ اِدھر سے اُدھر کر رہے تھے آخر میں انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ دن میں کام کے دوران ایک معمولی سا واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ مزدور سڑک بنانے میں لگے تھے، زمین ہموار کرتے کرتے جب وہ تالاب کے کنارے داہنی موڑ پر پہنچے جہاں سے گاؤں کا قبرستان شروع ہوتا تھا تو اچانک ایک لحد کھل گئی۔ اُس لحد میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا اور وہ کوئی حیرانگی کی بات نہیں تھی البتہ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ڈھانچے کے دائیں بازو کی ہڈی میں ایک چاندی کی چوڑی پٹی والی زنگ آلود چوڑی تھی جس کے بیچ میں فیروزی رنگ کا ایک نگ تھا۔ مزدوروں نے اس بات کی اطلاع انجینئر صاحب کو دینا مناسب جانا۔ انجینئر صاحب جائے موقعہ پر آئے۔ چوڑی کو ڈھانچے سے الگ کر دیا۔ کچھ دیر تک اُس چوڑی کو غور سے دیکھتے رہے پھر مُڑے اور کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر ڈاک بنگلے کو لوٹ گئے۔

وہ رات اُسی طرح بے چینی اور بے قراری میں گذر گئی۔ رات کے پچھلے پہر جب چاند رات بھر کا تھکا دینے والا سفر طے کر کے مغرب کے شبستان میں آرام کرنے کے لیے جانے لگا تو اکبر صاحب نے اپنی بیوی کے نام ایک خط لکھا جسے انہوں نے اپنے بند سوٹ کیس کے اوپر رکھا تا کہ آسانی سے نظر آسکے۔ وہ ڈاک بنگلے سے نکل پڑے۔ اُسی طرح دیوانہ وار جس طرح آج سے تیس برس قبل وہ اپنی معشوقہ سے ملنے تالاب پر نکل جایا کرتے تھے۔ اُنہیں لگا کہ جیسے ساجدہ اُن کو آج بھی پہلے ہی کی طرح بلا رہی ہے ـــــــ

پکار رہی ہے ـــــــ آوازیں دے رہی ہے ـــــــ

دور ـــــــ بہت دور ـــــــ منتھلا گاؤں سے کافی دور ـــــــ کشتواڑ کی طلسماتی اور مسحور کن حد بندیوں سے باہر ـــــــ کیلاش پربت کے پیچھے ـــــــ اونچے اونچے چیڑ کے پیڑوں کے اوپر سے ـــــــ بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں کے نزدیک ـــــــ کبوتروں کی ایک جوڑی بڑی تیزی کے ساتھ پرواز کرتی ہوئی نیلے آسمان کی وسعتوں میں کہیں اُڑتی ہوئی جارہی تھی ـــــــ آگے ہی آگے کو ـــــــ بے نشان منزلوں کی جانب ـــــــ مسرور وشاداں ـــــــ اور ـــــــ

اور صبح کی شہزادی مشرقی نور خانے سے چاندی کی پازیب پہنے ہنستی مسکراتی اپنے چہرے سے نورانی نقاب اُٹھاتی ہوئی صبح ہونے کا اعلان کر رہی تھی ـــــــ



خاندان کی ناک

متاعِ دل بھی گئی دل کی آرزو بھی گئی
مُجیبؔ کس سے شبِ غم کا ماجرا کہتے
(محبوب اللہ مجیبؔ)

خاندان کی ناک

پیاری سہیلی ناظمہ!

بہت دنوں کے بعد تمہارے خط کا جواب دے رہی ہوں۔ تاخیر تو بے شک ہوئی مگر باعث تاخیر کچھ بھی نہیں تھا۔ ناراض مت ہونا اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں خط لکھنے کے معاملے میں کتنی سُست واقع ہوئی ہوں۔ لکھنا چاہ رہی تھی مگر چاہنے کے باوجود بھی دو سطور لکھ نہ پائی۔

جب سے یہاں آئی ہوں اپنے آپ کو ایک نامانوس اور اجنبی ماحول میں پا رہی ہوں۔ بہت کوشش کی کہ میں اپنے آپ کو گھر کے کام کاج، یہاں کے رہن سہن، ماحول اور اُسی طرز زندگی کے ساتھ ایڈجسٹ کرلوں مگر کوشش کے باوجود بھی ایسا نہ ہوسکا۔ یہاں آنے کے بعد یا یوں کہوں کہ شادی کے دن سے ہی میری ساس، نند اور گھر کے دیگر افراد میرے آرام و آسائش اور میری ضروریات کا بے حد خیال رکھتے ہیں مگر کیا کروں دل کبھی اُن کی طرف مائل نہ ہوسکا اور اُن کے حسنِ سلوک کا قائل بن سکا۔ میں ظاہری طور اُن کے ساتھ ہنس بول لیتی ہوں۔ اُن کے احسانات کا اظہار بھی کرتی ہوں مگر ذہن پر ہر وقت ایک عجیب گرانی سوار رہتی ہے۔ من ایک بوجھ کے تلے دبا دبا سا رہتا ہے۔ میں چاہ کر بھی اس ماحول میں فٹ نہیں بیٹھ پا رہی ہوں۔

تمہارے دولہا بھائی تو لاکھوں میں ایک ہیں۔ وہ دن بھر اپنی زمین جائیداد کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور شام کو تھکے ماندے گھر لوٹ آتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اُن کی تھکن چند میٹھی میٹھی باتوں سے دور کردوں۔ اُن کے آرام و آسائش اور ضروریات کا خیال رکھوں مگر ایسا کرنا تو

دور، اُلٹا وہی میری ناز برداری کرتے رہتے ہیں۔ میری ضروریات کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ مختلف تحفے تحائف لالا کر مجھے خوش رکھنے کی ازخد کوشش کرتے ہیں مگر پیاری سہیلی جس کا دل ہی بجھ گیا ہو وہ بھلا کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ اُسے دنیاوی دلفریبیاں اور دلچسپیاں کیسے سنبھالا دے سکتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اپنے آپ کو کوستی ہوں۔ کیا کروں ایک عجیب الجھن سے دوچار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میں جھوٹ موٹ کا پیار نہیں جتا سکتی۔ مجھے بناوٹی ہنسی ہونٹوں پر سجانا نہیں آتی۔ میں اپنے آپ کو عاجز اور مجبور تصور کرتی۔ میں اُن کی چاہ رکھتے ہوئے بھی اُن کو چاہ نہیں پاتی۔ اپنا بنا کر بھی اپنا بنا نہیں پا رہی۔ اُن کے ساتھ رہ کر بھی اُن کو اپنا دل نہ دے سکی۔ میں کتنی بُری ہوں۔ قسمت نے مجھے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔

وہ دن بہت یاد آتے ہیں جب یونیورسٹی کی آزادانہ فضائیں تھیں۔ گھومنا، پھرنا، پک نکوں پر جانا، مستیاں کرنا اور کھل کر قہقہے لگانا۔ کبھی کینٹین میں غُل غپاڑہ کیا، کبھی ہوٹلوں میں لنچ لیا تو کبھی کیمپس کے چناروں کے سائے میں یا سیبوں کے پیڑوں کے نیچے مونگ پھلیاں پھوک ڈالیں۔ کبھی حضرت بل تو کبھی ڈل کے کنارے، کبھی نشاط باغ کو تو کبھی چار چناری پر، کبھی اس باغ میں تو کبھی اُس پارک میں کیا دن تھے وہ یار۔ مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں۔ یہاں ایک بہت بڑی حویلی ہے۔ حویلی کے بڑے بڑے دالان اور اندھیری غلام گردشیں ہیں، وسیع وعریض کمرے، کنگ سائز مسہریاں اور نہ جانے کیا کیا۔ ہاں گاؤں میں بلاشبہ قدرتی حُسن کی جلوہ سامانیاں دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ دل کو لُبھاتی ہیں مگر کیا کروں جب دل ہی بُجھ گیا ہو کسی بھی حسین چیز

میں دلکشی نہیں لگتی۔ بہاریں بے شک آتی ہیں مگر جس کا چمن ہی بہار سے پہلے خزاں دیدہ ہو چکا ہو وہ بھلا دنیاوی دلفریبیوں سے کیسے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ یہ دل کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

شیشہ ٹوٹے غُل مچ جائے
دل ٹوٹے پر آواز نہ آئے

تم نے لکھا تھا کہ رشیدؔ کی نوکری بھی لگی ہے اور اُس کی شادی بھی ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے آخر اُسے بھی تو اپنی زندگی سنوارنی ہی تھی۔ کیا میری یاد کے سہارے عمر بھر میرے نام کی مالا جپ کر جوگی بنا پھرتا۔ اُس کا کیا دوش ہے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے اُس کے ساتھ کون سی وفا کی جو وہ میرے لیے کنوارا بیٹھا رہتا۔ تم نے یہ بھی پوچھا تھا کیا اُس کی یاد اب بھی آتی ہے۔ بہن! راکھ سے خوابیدہ چنگاریوں کو کُریدنے سے کیا حاصل ہوگا۔ کیوں میرے زخموں پر نمک پاشی کرنا چاہتی ہو۔ جو ہوا سو ہوا اُسے جانے دو۔ اب اگر اُس کی یاد آتی بھی ہوگی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ حسرتیں ہمیشہ تمام نہیں ہوتیں، ساری آرزویں پروان نہیں چڑھتی۔ دل کے ناسور مشکل سے مندمل ہو پاتے ہیں۔

ناظمہؔ میری اچھی سہیلی! یہ پیسہ بھی کتنی بُری شئے ہے۔ اس پیسے نے مجھ سے میرا صبر و قرار چھین لیا اور میرے دامن کو صرف کانٹوں سے بھر دیا۔ میرے والدین کو گرچہ اس سودا بازی میں خاطر خواہ فائدہ ہوا مگر میرے لیے یہ سودا بہت گراں ثابت ہوا۔ میں پڑھی لکھی ہو کر بھی بغاوت نہ کرسکی، کچھ بھی نہ کرسکی، کچھ بھی نہ کہہ سکی، کیونکہ ایسا کرنے سے بقول بزرگوں کے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ یقین مانو عورت پائیلٹ بلکہ آسٹروناٹ ہو کر اونچائی تک

جا کر بھی کچھ معاملات میں آج بھی سماجی قید خانے کی زنجیریں توڑ نہیں سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر عورت آج بھی مظلوم ہے۔ آج بھی سارنگی کے ساز اور طبلے کی تھاپ پر گھنگھرو بج اُٹھتے ہیں۔ آج بھی قحبہ خانے آباد ہیں اور محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ آگے کوٹھا ہوتا تھا آج کوٹھی ہوتی ہے۔ پہلے مجرا ہوتا تھا آج کیبرڈ ہوتا ہے۔ پہلے عورتیں آنچل کی آڑ کرتی تھیں آج ٹی وی نے عورت کا آنچل ہی اڑا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنے مطلب سے غرض ہے، اپنی عیاشی کے ساتھ سروکار ہے اس لیے وہ عورت کو مختلف بہانوں اور مختلف طریقوں سے اپنے سامنے لاکر رسوا کرتا ہے۔

اب اور کیا لکھوں۔ تقدیر کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں جیسی گذر رہی ہے گذار رہی ہوں۔ ناکام آرزؤں نے کالے سایوں کی مہیب چادر تان لی ہے۔ ہر طرف گہرے سناٹوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ میں صحرا کی ایک سوکھی ٹہنی کی طرح بادِ مخالف کے تھپیراؤں کے رحم وکرم پر ڈولتی ہوئی، اتھاہ وسعتوں میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرے پاس ناآسودہ جذبات، شکستہ ارمان، رستے ناسور، درد کی ٹیس اور آنسوؤں کی لڑیاں ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ درد وکرب کی پونجی، آہ وکراہ کا بھنڈار، رنج والم کے خزانے، گھٹن وتاسف کی جھولیاں اور بہت کچھ۔ خیر چھوڑو یہ سب۔

میرا بھائی اسلم دو چار بار بلانے کے لیے آیا تھا مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ کبھی ہو سکے تو دو چار دن کے لیے چلی آنا، خوب باتیں ہوں گی۔ اچھا اب اجازت۔ خدا حافظ۔

تمہاری غمزدہ سہیلی

سلیمہ

اس خط کے لگ بھگ دو مہینے کے بعد ناظمہ کو سلیمہ کے شوہر کی جانب سے ایک مختصر سا خط ملا جو یوں تھا:

محترمہ ناظمہ جی!

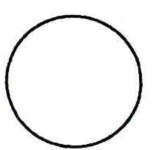
السلام علیکم

سلیمہ نے میرے سامنے کئی بار آپ کا ذکر کیا۔ مجھے آپ دونوں کی دوستی کے بارے میں بہت پہلے سے معلوم تھا۔ سلیمہ کی ڈائری سے آپ کا نیا پتہ نوٹ کر کے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں کہ آپ کی سہیلی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ دس روز قبل وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سوگوار

اکرم





انگارے

تو پلٹ کر دیکھتا صیاد کیا ہے بار بار
اب چمن میں گُل کسی شاخ پر کوئی نہیں
(اے مجید کشمیری)

انگارے

پُرہول سناٹا ــــــ ہُو کا عالم ــــــ کالی رات ــــــ بھیانک تاریکی ــــــ ہر طرف مکمل سکوت ــــــ خاموشی ــــــ ہر شئے تاریکی کے دبیز پردوں میں لپٹی ہوئی ــــــ ہر سُو اندھیرے کا راج ــــــ دور کوئی گیدڑ چیخا ــــــ دو چار الو درختوں پر پر پھڑ پھڑانے لگے ــــــ بھیانک آوازیں نکال کر اور اُڑ کر کہیں تاریکی کے سمندر میں کھو گئے ــــــ جھینگر جاگے اور بے ہنگم راگ الاپنے لگے ــــــ ندی سپاٹ تھی ــــــ اور خاموشی سے بہہ رہی تھی ــــــ ایک زوردار چھپاکا ہوا ــــــ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا ــــــ ایک شیشہ ٹوٹا ــــــ شیطان قہقہے لگانے لگا ــــــ اور اپنی شیطانی رقص میں مصروف ہوگیا ــــــ ندی میں دائرے سے بنتے چلے گئے ــــــ دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے ــــــ کچھ دیر کے بعد سمٹنے لگے ــــــ پانی کی سطح پھر ہموار ہوگئی ــــــ ندی پھر خاموشی سے بہنے لگی ــــــ اور پھر وہی پُرہول سناٹا ــــــ ہُو کا عالم ــــــ بھیانک تاریکی ــــــ

مئی کا مہینہ اور گاؤں کی ٹھنڈی میٹھی رات ــــــ پھر بھی میں بہت سویرے بلکہ منہ اندھیرے جاگ اُٹھا۔ گھر سے باہر قریب کے ایک بید سے ہری شاخ توڑ کر اُس کا مسواک کرتے ہوئے چشمے کی طرف نہانے کے لیے چل دیا۔ راستے میں کئی گاؤں والے ملے۔ کسی سے علیک سلیک، کسی سے مزاج پُرسی اور کسی سے سر کے اشارے سے بات چیت ہوگئی۔ مولوی صاحب نماز پڑھا کر مسجد سے لوٹ رہے تھے۔ پنڈت جی ندی سے نہا کر ہرے راما ہرے کرشنا کا جاپ کرتے ہوئے مندر کی طرف جا رہے تھے۔ رحیم چاچا اپنے صحن میں بیٹھے حقے کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ تاجو گائے کو دوہ

رہی تھی اور اپنی بہو جو ابھی خراٹے ہی لے رہی تھی، کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ اُس نے اپنی بہو کو کوسنے دیئے بچھڑے کو ایک طرف ہٹا کر میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا جس پر اُسے اور بھی تاؤ آ گیا اور وہ مجھے بھی دو چار بے نقطہ سنا کر گھر کے اندر دودھ کا برتن لے کر چلی گئی_____ حبیب اللہ اپنی دوکان کھول رہا تھا اور ساتھ میں ہی ڈسپنسری کے کمپونڈر کو بھی بد عائیں دے رہا تھا جس کی دوا سے اُسے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ پنگھٹ پر کچھ عورتیں پانی بھرنے کے ساتھ ساتھ ہنستی مذاق بھی کر رہی تھی۔ میں جب وہاں سے گذرنے لگا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں شاید اس لیے کہ اُن میں میری منگیتر بھی موجود تھی۔

چشمے پر کئی لوگ تھے۔ کچھ نہا رہے تھے۔ کچھ صرف ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔ کچھ پاس کی ہموار زمین پر نماز پڑھ رہے تھے اور کچھ بیٹھے سیاست اور تازہ ترین حالات پر بحث و مباحث کر رہے تھے۔ میں نہانے کے لیے کپڑے اتارنے ہی جا رہا تھا کہ مجھے دور سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ معاملے کی تحقیق کی خاطر میں ذرا رک گیا۔ کچھ دیر کے بعد دیکھا کہ کافی سارے لوگ چار پائی پر کسی کو اٹھاتے ہوئے ہماری ہی طرف چلے آ رہے ہیں۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ماسٹر دینا ناتھ کی بیٹی اوشا کی لاش تھی جو پاس والے گاؤں کے لوگوں کو صبح ہی پانی پر بہتی نظر آئی تھی۔

یہ خبر سارے گاؤں میں ایک دم پھیل گئی۔ ہر ایک پر سکتہ سا طاری ہو گیا مگر ساتھ میں ہی چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آخر میں مندر کے پنڈت جی نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا ندی چونکہ ہر سال انسانی قربانی لیتی ہے اس لیے اُوشا ندی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے اور یہ بھی کہ

اب گاؤں میں آئندہ کئی سال تک باڑھ آنے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ میں دل ہی دل میں پنڈت جی کے اِن سادہ لوح خیالات پر ہنسنے لگا مگر حق بات یہ ہے کہ مجھے اُوشا کے مرنے کا بے حد افسوس تھا کیونکہ چند لوگ ہی اس بات سے واقف تھے اور اندازہ کر سکتے تھے کہ اوشا پر کیا بیتی ہوگی یا اُس کے ندی میں کودنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

''اے کون ہو تم'' ــــــــ

''جی میں''۔

''میں کون۔ میں کا کوئی نام بھی ہے''۔

''جی میں''۔ الفاظ لڑکی کے گلے میں ہی اٹک گئے۔

''کیا میں میں لگا رکھی ہے۔ کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو''۔

''جی میں پھول چُن رہی ہوں''۔

''پھول کیوں چن رہی ہو''۔

''جی بس ــــــ یونہی ــــــ ہمارے سکول میں ایک فنکشن ہے''۔

لڑکی اچانک اور بے وقت کی دخل اندازی سے بدحواس ہو گئی تھی۔

''جانتی ہو میں بڑے لالہ کا بیٹا ہوں اور میری مرضی کے بغیر پھول توڑنا تو کیا اس باغ میں داخل ہونا بھی منع ہے''۔

''جانتی ہوں۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ اب پھول توڑنے یہاں کبھی نہیں آؤں گی''۔

بڑے لالہ کا بیٹا چونکہ حال ہی میں شہر سے تعلیم مکمل کر کے لوٹا تھا اس لیے وہ چالاکی اور مکاری میں اپنے باپ سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔ بڑا لالہ گویا گاؤں والوں کا ان داتا تھا۔ کئی غریب کسانوں کے زیورات اور برتن حتیٰ کہ

گھر بھی اُس کے پاس رہن تھے۔ ظاہری طور پر وہ گاؤں کا ایک دوکاندار شریف اور ہمدرد دکھتا تھا مگر در پردہ وہ پرلے درجے مکار اور شاطر مہاجن تھا۔ حکومت کے اہلکار اُس کی مٹھی میں تھے۔

بڑے لالہ کا بیٹا ہیرالال ہر رنگ میں رنگا مکمل طور سے ایک عیار اور شاطر زمیندار تھا۔ گاؤں کی ایک بھولی بھالی اور معصوم دوشیزہ کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپکنے لگی۔ اُسے ہراساں کرنے اور اُس پر اپنی بڑائی اور برتری کا سکہ جمانے کے لیے اُس پر رعب ڈالنے لگا۔ لڑکی بے حد شریف اور معصوم تھی اس لیے وہ ایسی سچویشن میں خوفزدہ ہوگئی۔ اُس کے ڈالی جیسے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے ماتھے پر جھلملانے لگیں۔ وہ جانے کے لیے مڑی ____ ''سنو'' ____ وہ ٹھہر گئی پر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہیرالال اُس کے قریب آ گیا اور دلچسپ مگر بھوکی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا'' ____

''اُوشا'' مختصر جواب ملا۔

''تم سچ مچ اُوشا ہو صبح کا تارا۔ تمہیں تو حویلی کی اُوشا ہونا چاہیے تھا''۔ ہیرالال کے چہرے پر تمام شیطنت اور خباثت رقص کرنے لگی۔ اُوشا کچھ نہ بولی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہیرالال کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اوشآ گاؤں کے غریب اُستاد ماسٹر دینا ناتھ کی بیٹی تھی۔ وہ مقامی سکول میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ بچپن میں ہی اُس کی ماں مرگئی تھی اس لیے ماں کی ممتا اور پتا کا پیار دونوں ہی اُسے ماسٹر دینا ناتھ سے ملے تھے۔ اُوشا بھی اپنے باپ کے سوا دنیا میں اور کسی کو نہ جانتی تھی اور نہ چاہتی تھی۔ اوشآ حقیقت میں بہت بھلی اور خوبصورت تھی۔ گلاب کی کلی کے مانند نازک، شرمیلی

اور باوقار۔ اُس کا چہرہ افق کی سپیدی اور شفق کی سرخی کا ایک امتزاج تھا۔ وہ پھولوں کی ڈالی بھی تھی اور ندی کی روانی بھی۔ وہ چاند کی چاندنی بھی تھی اور کلیوں کی مہک بھی۔

قدرت کی کرشمہ سازی حیران کن ہے مگر دوسری جانب اُس کی ستم ظریفی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ شہروں میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ گاؤں میں گرچہ کچھ بھی نہیں ہوتا مگر اکثر وہاں سب کچھ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ شہروں میں ہر چیز چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر بزرگوں کا کہنا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ وہاں رنگ ڈھنگ ہے چمک دھمک ہے، جھوٹی شان، فیشن اور چمکدار ملبوسات کی بھرمار ہے۔ پاؤڈر اور غازہ سے لت پت چہرے ہیں۔ سیاہ لاشیں سفید کفنوں میں ملبوس ہیں۔ کالے دل اُجلے چہروں سے ڈھکے ہیں۔ ہر وقت یہی احساس ہوتا ہے کہ سب جھوٹ ہے فریب ہے۔

گاؤں میں تعفن اور گندگی کے باوجود معصومیت، شرافت اور حقیقی حُسن کی دولت بے پایاں ہر طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر شئے جلوہ سامانیوں اور جملہ رعنائیوں سے پُر ہوتی ہے۔ اُوشا جیسی کئی ہرنیاں ہر پنگھٹ پر چہلیں کرتی اور کُلیلیں بھرتی ہوئی ملتی ہیں۔ ہر طرف ہنسی اور خوشی پھوٹتی ہے۔ حقیقی مسرت اُگتی ہے اور قہقہے چٹکتے ہیں۔ ہر کھیت سونے کا غالیچہ، ہر کھلیان مندر کا سنہری کلس اور کلیسا کی نقرئی گھنٹی ہے۔ بالیاں موتیوں کی لڑیاں اور دانے موتی ہوتے ہیں۔ ہر چہرہ چاند اور ہر ایک بندہ فرشتہ لگتا ہے۔

شہروں میں حُسن اپنی قیمت وصول کرنا خوب جانتا ہے جب کہ گاؤں میں یہی حُسن اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔ اُوشا دوسرے دن تو کیا لگ بھگ ہفتہ بھر

گھر سے باہر نہیں نکلی۔ سکول جانا تو درکنار وہ باولی پر پانی بھرنے بھی نہ گئی۔ کیونکہ اُسے ڈر تھا کہیں پھر سے ہیرالال اُس کے گلے نہ پڑ جائے۔ ہیرالال کے بدفطرتی اور بدکرداری کے چرچے گاؤں میں زبان زدِ عام تھے۔ دوسری جانب ہیرالال تڑپ رہا تھا۔ اُسے اوشا کی ایک ہی جھلک نے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اُس نے اُوشا سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر میں اُس نے گاؤں کی ایک حرافہ کو روپے پیسے کا لالچ دے کر اُوشا سے ملنے کی سبیل نکالنی چاہی مگر اُس میں بھی وہ ناکامیاب رہا۔ وصلِ یار اور آتشِ شوق اور بھی تیزی سے بھڑکنے لگا۔ آخر جب ہر تیر خالی گیا اور ہر ترکیب بیکار ہوگئی تو ہیرالال نے بڑے پیمانے پر جوڑ توڑ شروع کر دی۔

ایک دن جب ماسٹر دینا ناتھ پاس کے ہی ایک گاؤں میں ایک بارات کے ساتھ گئے ہوئے تھے تو ہیرالال نے اوشا کو اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے سے گھر سے بے ہوش کر کے اٹھوالیا۔ اُوشا کو جب ہوش آیا تو اُس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ وہ ہیرالال کے شبستان میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی اور ہیرالال بڑے غرور اور طنز کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ہرے راما _____ ہرے کرشنا _____ مجھے پنڈت جی کی آواز نے چونکا دیا _____ ماسٹر دینا ناتھ روتے پیٹتے بیٹی کی لاش کے جلوس میں شامل ہو گئے _____ اُن کے تار تار گریبان کی دھجیاں ہوا میں جھول رہی تھیں _____ اور دور سرمئی پہاڑوں کے پرے نقرئی بادلوں کا ایک سفینہ ہوا کے دوش پر سوار آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو رہا تھا اور ہیرلال جیسے شیطان کسی اور کی جھولی انگاروں سے بھرنے کی تیاری میں مصروف تھے۔

❖❖❖

انٹرویو

سجدے کرتے بھی ہیں خود انسان درِ انسان پہ روز
اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں
(عرش ملسیانی)

اِنٹرویو

(گھنٹی بجتی ہے چپراسی آفیسر کے کمرے میں داخل ہوتا ہے)

چپراسی: جی صاحب!

آفیسر: دیکھو جو لوگ باہر انٹرویو کے لی آئے ہیں اُن میں سے مسٹر قمر کو اندر بھیج دو۔

چپراسی: جی صاحب (باہر جاتا ہے)

ایک کاؤبوائے ٹائپ نوجوان کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

اُمیدوار: کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

آفیسر: آپ اب بھی اپنے کو باہر ہی سمجھتے ہیں۔ آیئے اور (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔

اُمیدوار: (بیٹھ کر) جی شکریہ!

آفیسر: کیا آپ ٹائپ کرنا جانتے ہیں؟

اُمیدوار: جی ہاں! یہ درخواست جو آپ کے سامنے ہے میں نے خود ہی ٹائپ کی ہے۔

آفیسر: بہت خوب ویسے سپیڈ کتنی ہوگی؟

اُمیدوار: یہی کوئی سو دو سو۔

آفیسر: (چونک کر حیرانگی کے ساتھ) جی؟؟

اُمیدوار: جی ہاں! کم از کم سو تو ہوگی ہی۔

آفیسر: اچھا، آپ نے کہاں تک پڑھائی کی ہے؟

اُمیدوار: گریجویشن سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر چکا ہوں اور ایم اے پُلکڈ

ہوں۔

آفیسر: آج کل آپ کا شغل کیا ہے؟

اُمیدوار سر کھچانے لگتا ہے اور کھسیانی ہنسی ہنستا ہے۔

آفیسر: ہاں! ہاں! کہیے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟

اُمیدوار: بات دراصل یہ ہے کہ میں ______

آفیسر: اجی! صاحب کہیے کیا بات ہے؟

اُمیدوار: (خفت مٹاتے ہوئے) میں دراصل شغل کے معنی نہیں جانتا ہوں۔

آفیسر: اُوہ۔ یہ بات ہے۔ خیر آپ یہ بتائیے کہ بی اے میں آپ نے کیا کیا مضامین لئے تھے۔

امیدوار: ہسٹری، پولٹیکل سائنس اور اُردو۔

آفیسر: اچھا یہ بتائیے کس زبان کے ساتھ آپ کا زیادہ لگاؤ ہے۔ انگریزی اور اُردو تو آپ نے پڑھی ہیں اور کشمیری ماشاء اللہ آپ کی مادری زبان ہے۔ کسی زبان کے ادب اور شعر وسخن سے دلچسپی ہے۔

امیدوار: جی ہاں! اُردو زبان کے ساتھ میرا اچھا خاصا لگاؤ ہے۔ میں شعر سننا اور سنانا پسند کرتا ہوں۔ میں مضامین بھی لکھتا ہوں۔

آفیسر: اچھا بتائیے اُردو زبان کا پہلا شاعر کون تھا؟

امیدوار: (پھٹ سے) ڈاکٹر اقبال۔

آفیسر: بہت خوب! اچھا کوئی شعر سنائیے جو آپ کو پسند ہو۔

اُمیدوار: سنیے ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

آفیسر: سبحان اللہ! بھئی بہت اچھے۔ آپ تو ایک سلجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔
اچھا ولی دکنی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
امیدوار: جناب اُنہیں کون نہیں جانتا۔ موجودہ دور کے مشہور ناول نویس ہیں۔
انہوں نے کئی معرکتہ الآراء جاسوسی ناول بھی لکھے ہیں۔
آفیسر: خوب۔ بہت خوب۔ اچھا یہ بتائیے بال جبریل کن صاحب کی تصنیف
ہے؟
امیدوار: مولانا حالیؔ کی۔
آفیسر: اچھا یہ بتائیے غالب کیوں مشہور تھا؟
اُمیدوار: کیونکہ وہ شراب پیتا تھا۔
آفیسر: اچھا دیوان غالبؔ سے ایک ایسا شعر سنائیے جو آپ کو بہت پسند ہو۔
اُمیدوار: جی ضرور۔ سنیے ________

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا

آفیسر: بہت خوب۔ سبحان اللہ۔ واہ! واہ! اچھا صاحب ہسٹری تو آپ کا
مضمون رہا ہے۔ یہ فرمائیے کہ چندر گُپت موریہ تاریخ میں کیوں مشہور
ہے؟
اُمیدوار: جناب عالی پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ملک کا واحد بادشاہ تھا اور بادشاہ تو
مشہور ہوتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے محمود غزنوی کو پے در پے کئی
شکستیں دیں تھیں اور اس طرح رعایا میں ہر دلعزیزی حاصل کی۔ وہ
جمہوریت پسند تھا۔ اُس نے لوگوں کی سہولیات کے لیے کئی چبوترے
بنوائے تھے تا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر تبادلہ خیالات کر سکیں۔ اس کے

علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں جن کا بتانا بے کار ہے۔

آفیسر: نہیں نہیں ضرور بتائیے۔ کم از کم ایک دو تو بتائیے۔

اُمیدوار: اُس نے کئی براہمن دوسرے ملکوں کو روانہ کئے تا کہ وہ ہندو دھرم کا پرچار کرسکیں۔ اُس کے عہد میں ہندو دھرم کو عروج حاصل ہوا۔ اور اُس نے اپنے بیٹے کو سپاہ گری کی تربیت کے بجائے علم موسیقی کے ساتھ روشناس کرایا کیونکہ وہ خود بھی ایک اونچے پائے کا ستار نواز تھا۔

آفیسر: بہت اچھے آپ نے تو وہ باتیں بتائیں جو آج تک نہ کسی نے بتائی ہیں اور نہ کسی سے سنی ہیں۔ ویسے آپ نے یہ سب ہسٹری کی کون سی کتاب میں پڑھا ہے؟

اُمیدوار: (مسکرا کر) ایچ جی ویلز کی شہرۂ آفاق تصنیف ''ہسٹری آف دی ورلڈ'' میں۔

آفیسر: اچھا صاحب یہ بتائیے حالیہ جنگ میں اسرائیل کس کے ساتھ لڑ رہا تھا؟

اُمیدوار: عمان کے ساتھ۔

آفیسر: عمان کہاں ہے؟

امیدوار (جھٹ سے) نقشے میں۔

آفیسر: نقشہ کہاں ہے؟

اُمیدوار: میرے کمرے میں۔

آفیسر: بہت خوب۔ نہیں تو کہاں ہوسکتا ہے۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ ہندوستان کا وزیر دفاع کون ہے؟

اُمیدوار (دیکھ سوچ کر) بلرام جھاکڑ۔

آفیسر: بجافرمایااورامریکہ کاصدرکون ہے؟

اُمیدار: کینیڈی۔

آفیسر: ایم پی کس کامخفف ہے۔

اُمیدوار: ملٹری پولیس کا۔

آفیسر: ہندوستان کاکون ساعلاقہ آج کل قحط کاشکار ہے۔

اُمیدوار: رائے بریلی۔

آفیسر: اُوہ۔اچھااچھابریلی کے بارے میں آپ کاکیاخیال ہے۔

اُمیدوار: وہاں فلمیں بنتی ہیں۔

آفیسر: اچھاکسی مشہورفلمی ہیروکانام بتائیے۔

اُمیدوار: (ایک لمحہ ضائع کئے بغیر) امیتابھ بچن۔

آفیسر: اچھا صاحب یہ بتائیے کہ حال ہی میں دنیا کے کس ملک نے ہائیڈروجن بم کاتجربہ کیا۔

اُمیدوار: نیوزی لینڈ نے۔

آفیسر: ویری گڈ یہ بھی ارشادفرمائیے کہ الجیریا کب آزادہوا؟

اُمیدوار: جب اُسے آزادی دی گئی۔

آفیسر: ٹھیک ہے مگراُسے کس نے اورکب آزادی دی؟

اُمیدوار: اُسے امریکہ نے ۱۹۶۰ء میں آزادکیا۔

آفیسر: اچھاپنجاب کے پانچ دریاؤں کے نام بتائیے؟

اُمیدوار: گومتی، نربدا، تاپتی، جہلم اور چناب۔

آفیسر: آپ کی جنرل نالیج توغیرمعمولی ہے۔اچھا کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلرکون صاحب ہیں؟

امیدوار: آغا اشرف علی صاحب۔

آفیسر: کیا فیملی پلاننگ ضروری ہے۔

اُمیدوار: جی نہیں۔

آفیسر: وہ کیوں؟

امیدوار: کیونکہ اگر بچے نہ ہوئے تو سکولوں میں پڑھنے کون جائے گا۔

آفیسر: ہندوستانی سادھو اور امریکی ہپی میں کیا فرق ہے؟

امیدوار: کوئی خاص نہیں۔ دونوں ہی لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ اور دونوں ہی چرس پیتے ہیں۔

آفیسر: شاباش۔ ویری گڈ۔ شکریہ اب آپ جاسکتے ہیں۔

امیدوار: (ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے) یہ دیکھئے۔

آفیسر: یہ کیا ہے؟

اُمیدوار: ندیم صاحب کا خط۔

آفیسر: یہ پہلے کیوں نہیں دیا۔ خیر لائیے۔

(پڑھ کر اور مسکرا کر) اچھا صاحب جائیے اور کل سے کام پر آجائیے۔



اگلی بہار میں

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
(میر تقی میرؔ)

اگلی بہار میں

حسب معمول رنگین بہاروں نے وادیٔ کشمیر کے ماتھے پر بوسہ دیا اور راحت وطمانیت کے پر پھیلا دیئے۔ سیاح جوق در جوق جھلسا دینے والی گرمی سے فرار حاصل کر کے ٹھنڈی میٹھی آسودہ گود میں سکون و اطمینان کی سانسیں لینے لگے اور حسین و دلکش نظاروں، عطر بیز ہواؤں، مسحور کرنے والے شب و روز میں کھو گئے۔ ______

شمی روز شام کے وقت بابو کو اپنے چھوٹے سے شکارے میں بٹھا کر کبوتر خانہ تک سیر کرانے لے جاتی۔ بابو کا دل بہلاتی اور اُس کی خدمت کرنا تو وہ اپنا فرض سمجھتی تھی کیونکہ بابو نے اُس کے باپ کا چھوٹا سا ہاؤس بوٹ نما ڈونگہ پورے ایک ماہ کے لیے اچھے خاصے کرایہ کے عوض لے رکھا تھا۔

یہ روز کا معمول ______ روز کی خواہش ______ اور یہ روز کی خواہش ______ روز کی عادت بن گئی اور اس طرح کے معمول کے اور قربت کے پھندے نے ______ اُن دونوں کو ایک حسین پھندے میں جکڑ لیا ______ پکڑ لیا ______ قید کر لیا ______ اپنے اندر سمیٹ لیا ______ اور مدغم کر لیا۔ ______ شمی ______ شمی نہ رہی ______ بابو بن گئی ______ اور بابو ______ بابو نہ رہا ______ شمی بن گیا ______ دونوں ایک ہو گئے ______ شمی بابو بن گئی اور بابو شمی بن گیا ______ مقدر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں ______ دو ناموں کا ______ دو تہذیبوں کا ______ دو زبانوں کا ______ دو پیشوں کا ______ اور دو دلوں کا یہ سنگم ______ کتنا عجیب ______ مگر پُرکیف تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے۔مگر محبت بذاتِ خود ایک زبان ہے۔ جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتی ہے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ جاتی ہے۔شمی نے بابو کی زبان کو سمجھا اور بابو نے شمی کو زبان کو ____ دل ایک ہو گئے ____ جاں ایک ہو گئی ____ ڈل کا نیلا پانی گواہ بنا ____ نظاروں اور کہساروں نے شہادت دی ____ دونوں کے دلوں میں ایک جوت جگی ____ ایک تیر لگا ____ ایک کسک اٹھی ____ میٹھا میٹھا درد پیدا ہوا ____ مگر یہ کسک بھی کتنی میٹھی اور رسیلی تھی۔

تبسم مسکراہٹ میں ____ مسکراہٹ ہنسی میں ____ اور ہنسی قہقہوں میں تبدیل ہو گئی ____ کیوپڈ اپنا تیر چلا چکا تھا ____ وہ اپنا کام کر چکا تھا ____ اس لیے قہقہے لگا رہا تھا ____ اپنی کامیابی پر ____ خوش ہوتا رہا ____

شب و روز کی چکی میں دن پستے گئے ____ اور کیلنڈر سے ایک ورق گر پڑا ____ ایک مہینہ بیت گیا ____ پتہ ہی نہ چلا ____ بابو کی چھٹیاں ختم ہو گئیں ____ وہ چلا گیا ____ شمی سے دور ____ بہت دور ____ اپنے دیس ____ اپنے گھر ____ اپنے لوگوں میں ____ مگر شمی سے وعدہ کرتا گیا کہ اگلی بہار میں ____ مگر دنوں میں پھر آئے گا ____ اور شمی کو اپنے ساتھ ____ اپنی دلہن بنا کر ____ اپنے دیش ____ اپنے گھر ____ اپنے لوگوں میں لے جائے گا ____ پڑھنے کا غم اور امتحان کا جھنجٹ نہیں ہو گا ____ اُس کا باپ لکھ پتی ہے ____ کئی ملوں کا مالک ہے ____ وہ ماں باپ کی تنہا

اولاد ہے ______ خود مختار ہے ______ اُس کی مرضی اُس کے والدین کی مرضی ہے ______ شمی حسین خوابوں کی دنیا میں کھوگئی ______

اگلی بہار آئی ______ گذرگئی ______ گرمیاں آئیں ______ ختم ہوگئیں ______ سیاحتی سیزن اختتام پذیر ہوا۔ پر بابو نہیں آیا۔ ہاؤس بوٹوں پر ٹولیٹ (To let) کی جھنڈیاں لہرانے لگیں ______ مغل باغات کے جھرنے سو گئے ______ فوارے مراقبے میں بیٹھ گئے ______ اور خزان کا دیو گھیرو سے لباس میں ملبوس دندناتا آیا ______ چمن ویران ہوگئے ______ بلبلیں خاموش ہوگئیں ______ اور پیڑ پودوں نے بیوگی کا جامہ زیب تن کیا ______ اسی طرح سردیاں بھی آکر گذرگئیں ______ شمی کی انگلیاں دن گنتے تھک گئیں ______ اور پھر ______

اگلی بہار آئی ______ کلیاں چٹکنے لگیں ______ زمین پر سبز مخملی چادریں بچھ گئیں اور ساتھ ہی شمی کا پژمردہ دل بھی کھِل اٹھا ______ ایک پھول کی طرح ______ دن قریب آنے لگے ______ اُس کا انتظار ختم ہونے والا تھا ______ سیزن پورے جوبن پر تھا ______ اُن کے بوٹ میں بھی لوگ آتے رہے جاتے رہے ______ پر بابو نہیں آیا۔

وہ دن بھر کبھی ڈل کے کندے پر کبھی اپنے بوٹ کے اگلے حصے پر نظریں جمائے، ٹکٹکی لگائے بابو کی راہ دیکھا کرتی مگر جس کو نہ آنا تھا وہ کیونکر آتا۔ شمی روز شام کو اُسی چھوٹے سے شکارے میں بیٹھ کر کبوتر خانے تک جاتی۔ وہ آہستہ آہستہ چپو چلاتی اور دل شکن لہجے میں واویلا کرتی ______

ژولہ ہما روشے روشے

پوشے متہ جانا نو

(کیوں مجھ سے دور چلے گئے میرے پھولوں کے شہزادے۔اب تو آ)

کھانا پینا پہننا چھوٹا ___ زندگی بدمزہ ہو کر رہ گئی مگر بابو کی یاد دل سے نہ مٹ سکی۔شمی اب بھی اپنے آپ کو طفل تسلیاں دیا کرتی ___ ہو سکتا ہے کہ وہ بے حد مصروف ہوں یا انہوں نے اب کی نہیں ___ بلکہ اگلی بہار میں آنے کا وعدہ کیا ہو ___ اور پھر شمی اگلی بہار کے انتظار میں پہاڑ سے دن اور قیامت سی راتیں کاٹنے لگی ___ اگر چہ اُس کا حوصلہ اب بھی نہ ٹوٹا تھا ___

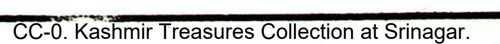
ایک اور بہار آکر گذر گئی ___ کچھ اُمنگیں جوان ہوئیں ___ کچھ ولولے تڑپ اُٹھے ___ سال آیا اور بیت گیا ___ لاکھوں لوگوں نے دنیاوی دکھوں سے نجات پائی اور لاکھوں دنیا کی مصیبتوں اور دکھوں سے ہمکنار ہونے کے لیے آئے ___ پر بابو نہ آیا ___ کیا اُسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ کوئی شمی اُس کے انتظار میں ___ اُس کی راہوں میں ___ آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے ___ اُس نے کسی سے کوئی وعدہ کیا ہے ___ حالانکہ وہ اب بھی قطعی نا اُمید نہیں ہوئی تھی ___ اُس کا حوصلہ برقرار تھا ___ وہ ہر روز معمول کے مطابق چھوٹے سے شکارے میں بیٹھ کر کبوتر خانے تک جاتی اور اپنے دل کے زخموں کا مداوا ڈل کے نیلے پانی اور چاندنی کی خنک خنک کرنوں میں ڈھونڈتی ___ مگر آخر کب تک ___

شمی انتظار کرتے کرتے اب تھک چکی تھی ___ ٹوٹ چکی تھی ___ اُس کا جسم اب ایک عجیب قسم کا بوجھ اور ایک عجیب طرح کی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا ___ وہ بے چین اور بے کل ہر وقت ایک

اضطراب میں رہتی ______ اُس پر ایک الجھن سی سوار رہتی ______ اور اسی شب و روز کے چکر میں جب ایک دن وہ صبح کو دیر تک نہ جاگی اور یوں ہوا کہ ______ وہ ماں کے جگانے پر بھی نہ جاگی ______ اور انتظار و آرزو کی یہ مورت ______ اصل میں کوئی اور ہی صورت اختیار کر چکی تھی ______

کہتے ہیں اب بھی ______ بہت رات گئے ______ چاند کی نقرئی روشنی میں ______ جب کرنیں پانی پر اٹھکیلیاں کرتی ہوتی ہیں ______ ایک لڑکی چھوٹے سے ______ شکارے میں بیٹھ کر ______ آہستہ آہستہ چپو کھینچتی ______ مدہم سروں میں ______ مگر بڑے ہی دل شکن ______ اور درد بھرے لہجے میں ______ کبوتر خانے کے آس پاس ______ تنہائی ______ انتظار ______ اور آرزو ______ کے گیت گاتی دکھائی دیتی ہے ______ لوگ کہتے ہیں ______ کہ وہ شمی کا بھوت ہوتا ہے ______ اب کسے پتہ ہے ______ کہ وہ بھوت بھی ______ اپنے بابو کے انتظار میں ______ اپنے بابو کی راہ دیکھتا ہو ______ وہ بابو ______ جو وعدہ کر کے تو جاتے ہیں ______ مگر لوٹ کر کبھی نہیں آتے ______ کبھی نہیں ______

❖❖❖



کون گلی گیوٚ شام

اُمید تو بندھ جاتی تسکین تو ہوجاتی
وعدہ وفا نہ کرتے وعدہ تو کیا ہوتا
(چراغ حسن حسرتؔ)

کون گلی گیوٗ شام

رات ــــــ دن سے جنم لیتی ہے اور دن ــــــ رات کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کا چکر تیز رفتاری کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ عمریں گھٹتی ہیں ــــــ عمریں کٹتی ہیں۔ کچھ زخم مندمل ہوجاتے ہیں اور بیشتر تازہ ہوکر ناسور بن جاتے ہیں۔ کچھ زخموں پر زمانے کی ہوائیں مرہم لگاتی ہیں مگر کچھ پر نمک پاشی بھی کرتی ہیں۔ وقت گذر جاتا ہے ــــــ بھاگتا ہے ــــــ تیز رفتاری کے ساتھ ــــــ اندھا دُھند ــــــ پیچھے مڑتا نہیں ــــــ نہ کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت اٹھاتا ہے۔ اسی رات اور دن کے گرداب میں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ پُرانی طاقِ نسیاں کی نذر ہوکر ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ اُن کی جگہ نئی کہانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی دل ودماغ اور جذبات میں ہیجان بپا کرتی ہیں۔ کبھی کچھ دیر کے لیے ماضی سے توجہ ہٹا کر حال کے آئینہ خانوں میں جھانکنے کے لیے اُکساتی ہیں۔ مستقبل کے لیے غور وفکر کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ ماضی اگر ازل ہے تو مستقبل ابد ہے۔ اسی ازل اور ابد کے درمیانی وقفے کا نام حال ہے۔ ماضی بھولی بسری حسین یادوں کا ایک خواب ہے۔ مستقبل دبیز اور تہہ در تہہ تاریک پردوں میں لپٹی ایک انجانی اور ان دیکھی منزل ہے۔ جس کی نشاندہی حال کرتا ہے اور حال کا یہ قلیل وقفہ ہمارا ہے اگر چہ بہت کم اور مختصر ہے۔

ہماری گلی سے کوئی گذرے اور وہ اندرآوتی کو نہ دیکھے یا اندرآوتی اُسے نہ دیکھے یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ صبح، شام، دن کو یا رات کے وقت جو کوئی بھی گلی سے گذرے گا وہ اندراوتی کو ضرور کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی ہوئی دیکھے گا۔ وہ ہر گذرنے والے کو بہت غور سے دیکھتی ہے اور محلے کا چھوٹا بڑا، مرد عورت

اُسے ضرور سلام کرے گا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد وہ وہی سوال، وہی ایک سوال ہر گذرنے والے یا ہر سلام کرنے والے یا والی سے پوچھے گی۔

''سنو! میں پوچھتی ہوں بہار آنے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے''۔

موسم بہار کا ہو یا خزان کا۔ گرمیوں کے دن ہوں یا سردیوں کی راتیں۔ اُس کی زبان پر ہمیشہ وہی ایک واحد سوال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی دیر رات میں گلی سے گذرے گا تو اُسے اندراوتی کے گانے کی آواز بھی سنائی دے گی۔ وہی پیار کا راگ ـــــ محبت اور انتظار کا نغمہ ـــــ ٹوٹے دل کی صدا۔

جب میں چھوٹا تھا اُن دنوں بھی میں اندراوتی کو اُسی دریچے پر بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہر ایک آنے جانے والے سے وہی ایک ماتر سوال پوچھا کرتی تھی۔ کسی وقت اگر اتفاقاً گلی سے ذرا دیر سے گذرتا یا کسی دعوت وغیرہ سے گھر والوں کے ساتھ رات گئے لوٹتا تو اُس وقت بھی مجھے اندرواتی کے گانے کی آواز سنائی دیتی۔ اُن دنوں مجھے اُس کی آواز بڑی پیاری اور میٹھی لگتی تھی مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میری سمجھ میں یہ بات آتی گئی کہ وہ پیار بھرے نغمے نہیں بکھیرتی ہے بلکہ وہ فریاد کرتی ہے۔ اُس کی آواز میں مٹھاس کی جگہ زندگی کی تلخیاں گھلی ہوئی ہوتی تھیں۔ اُس کی دہائی میں لوچ اور رس نہیں بلکہ آہیں، چیخیں اور کراہیں ہوتی تھیں۔ اُس کا نغمہ ساز نہیں سوز ـــــ آہ ـــــ کراہ ـــــ تڑپ ـــــ اور کرب ہوتا تھا۔ آج کل جب کہ میں جوان ہو چکا ہوں، گھر بار بلکہ بال بچوں والا ہوں آج بھی میں اندرواتی کو اُسی کھڑکی سے لگ کر بیٹھا دیکھتا ہوں۔ اُسی انداز سے وہ ہر ایک آنے جانے والے سے وہی سوال پوچھتی ہے۔

''میں پوچھتی ہوں بہار آنے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے''

چونکہ میرے والد صاحب میرے بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے اس لیے میں نے اپنی والدہ سے کئی بار اندراوتی کے بارے میں استفسار کیا مگر وہ بھی اس محلے میں بہو بن کر ہی آئی تھی اس لیے وہ بھی مجھے اس کے علاوہ اور کچھ نہ بتا سکی کہ کہتے ہیں وہ بچپن میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔

اندراوتی______

لگ بھگ پچانوے سالہ ایک بُڑھیا۔ سفید روئی جیسے بال، نورانی چہرہ، چہرے کے آر پار پچانوے برسوں کی سرد و گرم موسموں کی گہری گہری جھریاں______ دراز قد______ دھان پان جسم______ کمر میں ہلکا سا جھکاؤ۔ روایتی کشمیری لباس فرن میں ملبوس______ کیا وہ پاگل ہے______ رب جانتا ہے مگر عام لوگوں کا یہی خیال ہے کہ اُس کا دماغ صحیح نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی ثابت ہو جاتی تھی جب وہ بہار کے موسم میں بھی پوچھا کرتی کہ بہار آنے میں ابھی کتنے دن باقی۔ اندراوتی کے دیور، دیورانیاں ہیں، اُن کے بچے ہیں بلکہ بچوں کے بھی بچے ہیں۔ بھرپور گھر مگر اس کے باوجود بھی وہ تنہا تھی۔ اکیلی ذات______ ندی میں بہنے والا گھاس کا ایک تنکا جس کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔ پچاسی برسوں سے اُسی دریچے پر بیٹھے رہنے کے سبب وہ بھی کھڑکی کا ہی ایک حصہ لگتی تھی۔ جیسے مہاراجہ کے وقت کے ایک پرانے لکڑی کے فریم میں لگی ایک تصویر۔

چونکہ ایک لکھاری کی پیدائش کے ساتھ ہی تجسس کا کیڑا ابھی تولد ہوتا ہے۔ اس لیے میری یہ شروع سے ہی چاہ تھی میں اندراوتی کے بارے میں اصلی حالات سے جانکاری حاصل کروں۔ میں نے جب یہ سنا کہ میر صاحب جو محلے کے ایک بزرگ شخص تھے، کو اندراوتی کی اصل کہانی معلوم

ہے تو میں نے اُن سے منت سماجت کر کے اصلی واقعات بتانے پر راضی کر لیا حالانکہ اولاً تو انہوں نے کوئی بات بتانے سے صریحاً یہ کہہ کر انکار کیا کہ اُنہیں اس بارے میں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ بہر حال آخر کار انہوں نے کہا:

''میں اور ہری کرشن بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ہمارا بڑا یارانہ تھا۔ ہری کرشن کے باپ کو اندراوتی کے باپ کے ساتھ پکا دوستانہ تھا اور یہ دوستی زیادہ مضبوط اور پائیدار بنانے کے لیے انہوں نے اپنے بچوں کی آپس میں شادی کر دی حالانکہ وہ اُن کے شادی کی عمر تھی ہی نہیں۔ ہری کرشن کی عمر یہی کوئی دس گیارہ برس اور اندراوتی صرف نو برس کی تھی۔ شادی کے بعد اندراوتی ـــــــ ہری کرشن کے گھر تو آ گئی مگر اُس معصوم جان کو یہ معلوم نہ تھا کہ شادی کیا ہوتی ہے۔ یہ گرم اور میدانی علاقہ نہیں ہے۔ ہمارے جیسے سرد اور پہاڑی علاقوں میں بچے دیر سے بلوغیت پاتے ہیں۔ وہ سسرال میں بھی اودھم مچاتی جیسا کہ چھوٹے بچوں کا دستور ہے اور گڑیاں کھیلتی۔ ہری کرشن کھیل کود میں اُس کا ہمجولی ہوتا۔

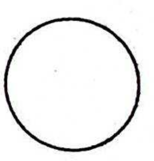
اس طرح سے دو سال بیت گئے۔ اندراوتی ہر چوتھے پانچویں روز مائیکے جاتی اور ایک دو روز ٹھہر کر واپس لوٹتی۔ کبھی کبھی میں بھی اندراوتی کے ساتھ اُس کے مائیکے تک جاتا اور اُس کو وہاں چھوڑ کر آتا۔ اُس وقت بھی اُسے نہ مائیکے جانے کا اور نہ واپس سسرال لوٹنے کا کوئی اندازہ کوئی احساس تھا۔ ایک زمانہ گذر گیا ـــــــ ایک دفعہ یہی بہار کے دن تھے۔ روپہلی دھوپ سہانی اور اچھی لگ رہی تھی ہری کرشن کے سارے گھر والوں نے روایتی کشمیری ڈھنگ سے بادام باغ میں گھومنے کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ دن بھر سب نے مقدور بھر کھیلا کودا، کھایا پیا، خوشیاں منائیں اور شام کو جب لوٹنے لگے تو اچانک

بارش ہوئی۔ سارے افرادلت پت ہو گئے۔ بہر حال گھر پہنچتے ہی سبھوں نے کپڑے تبدیل کئے۔ کسی نے بھی کوفت محسوس نہیں کی البتہ دن بھر کی لطف اندوزی سب کے چہروں سے جھلک پڑتی تھی۔ مگر اُسی رات ہری کرشن کو بخار چڑھا۔ بخار تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ اُن دنوں ڈاکٹر اور ڈاکٹری علاج کا زیادہ چلن نہیں تھا۔ حکیموں اور ویدوں نے جان توڑ کوشش کی۔ اپنا بہترین تجربہ علاج معالجے میں صرف کیا مگر ہری کرشن کا بخار نہیں ٹوٹا۔ وہ صحت یاب نہ ہوسکا اور اُسی حالت میں دسویں دن سورگ باش ہو گیا۔ اندراوتی کو جب اپنی حیثیت کا اندازہ ہری کرشن کے گھر میں ہوا، اُس وقت وہ ودھوا ہو چکی تھی۔ دلہن کے ابھی پھیرے بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ اُس کی چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ سہاگ کا سرخ جوڑا ابھی سلوٹوں سے دو چار بھی نہ ہوا تھا کہ سفید دھوتی زیب تن ہو گئی۔

وہ دن اور آج کا دن۔ اندرآوتی کھڑکی پر بیٹھی ہری کرشن کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اُس پگلی کو پکا یقین ہے کہ آج نہیں تو کل وہ ضرور واپس لوٹے گا۔ اُس کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ بہار میں ضرور آئے گا۔ کتنے بہار آکر گذر گئے مگر ہری کرشن لوٹ کر نہیں آیا اور نہ ہی اندراوتی کا انتظار ختم ہوا۔

اتنا کہہ کر میر صاحب نے اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھا اور ایک لمبی آہ بھر کر مجھ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ میں نے سہارا دے کر اُسے اُٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور دُور ــــــ دُور گلی کے نکڑ سے اندراوتی کے وہی پیار اور انتظار کے ملکوتی نغمے فضاؤں میں بکھر رہے تھے اور میں بجھے بجھے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جانے لگا ــــــ

❖ ❖ ❖



اور وہ ناچ رہی تھیں........

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہیں
(ساحرلدھیانوی)

"ملیح آباد بڑا سرسبز قصبہ ہے۔ یہاں آم کے گنجان باغ اور گیہوں کی فصل بڑی اچھی ہوتی ہے۔ نہروں سے پہاڑ کا سرد پانی آتا ہے اور بجلی کی مشینوں سے کنویں کا پانی نکال کر کھیتوں اور باغوں کو سینچا جاتا ہے۔ جب آم میں بور آتا ہے اور جب سرسوں پھولتی ہے اور ہر طرف زرد زرد مخمل سے بچھے نظر آتے ہیں اور سرسوں کی بھینی بھینی خوشبو کا سرور چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔

یہ قصبہ لکھنو شہر کے قریب ہے۔ لکھنو صوبہ اُتر پردیش کی راجدھانی ہے۔ اگر آپ ریل گاڑی سے دہلی کا سفر کریں تو لکھنو سے تیرہ چودہ میل پر آموں کے باغوں کے بیچ سے گاڑی گزرنے لگے گی اور آپ اس قصبے کو پہچان جائیں گے۔ پوری لاین پر اتنے گنجان باغ آپ کو کہیں اور نہ ملیں گے"۔

مائل ملیح آبادی

اس خوبصورت قصبے میں ہم بھی ایک بار یونیورسٹی کے ایک ساتھی اور دوست کے مہمان ہوئے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ موسم بڑا مسرور کُن اور خوشگوار تھا۔ شام کے وقت اُس کے بہت سارے دوست اور احباب چوپال پر جمع ہوئے۔ بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ اسی دوران اُن کے ایک دوست ٹھاکر روپ سنگھ نے حاضرین کو ایک کہانی سنائی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

مجرے میں سامنے بیٹھنے والوں میں سے سیٹھ گلاب رائے سب سے زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔ وہ اپنی توند پھیلائے، سگریٹ اور شراب نوشی کے شغل میں مصروف تھے اور رجنی کی ایک ایک ادا انہیں مدہوش کر رہی تھی۔ انہوں نے رجنی کے قدموں پر نوٹوں کے انبار لگا دیئے۔ وہ رجنی کی ایک ایک ادا پر نثار ہورہے تھے۔

رجنی گانے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ یہ ساز و آواز اور رقص کا سنگم دیکھنے اور سننے والوں کو مست کیئے دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا ماحول ہی ناچ رہا ہے، گا رہا ہے اور تھرک رہا ہے۔ اور پھر جب گیت تمام اور رقص تھم گیا تو محفل میں بیٹھے حاضرین کو لگا کہ وہ سحر سے چھوٹ کر کسی اور ہی دنیا میں آگئے ہیں۔

رجنی ایک خوبصورت ______ بلکہ بہت ہی خوبصورت طوائف تھی۔ اُس کی مدھر تانوں، مست کر دینے والے رقص اور جسمانی خوبصورتی نے سارے بازار میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اُس کے کوٹھے پر ہر شام آنے والے اور دھن لٹانے والے عیاش لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جب اُس کی مدھر اور رسیلی تانیں فضا میں گونجتی تو لگتا تھا کہ سارے عالم پر مدہوشی چھا رہی ہے۔ راہ

گیر تک چلتے چلتے تھم جاتے۔

آج رجنی دُلہن ہے۔ دیگر طوائف سہیلیوں کے جھرمٹ میں _____ چودھویں کا چاند _____ اُس کے حسین چہرے سے شرارے پھوٹ رہے تھے _____ بجلیاں جیسی چمک رہی ہیں _____ پر وہ چپ چاپ اور گم سُم ہے _____ باہر سے تو وہ خاموش تھی پر اُس کا دل تلاطم خیز _____ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بنا ہوا تھا _____ کیونکہ بات ہی شاید کچھ ایسی تھی۔

رجنی ایک خوبصورت طوائف _____ مہکتی ہوئی کلی _____ کوکتی کوئیل _____ ڈولتا بادل _____ رنگین پروں والی نازک اور دلربا تتلی جیسی _____ اُس کی بازار میں ساکھ تھی _____ عزت تھی _____ اور ایک اچھا ''بزنس'' تھا۔ پر وہ ابھی تک کنواری تھی _____ اور طوائف آئین کے مطابق اُس کی نتھ ابھی اتاری نہیں گئی تھی _____ جانے اُس کی ماں بیلا بائی کو کس کا انتظار تھا۔ موٹا مرغا پھنسنے کی بات نہیں تھی کیونکہ ابھی تک تو کئی رئیسوں اور زمینداروں نے اس ''مبارک رسم'' کو انجام دینے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر بیلا بائی اس بات کو ٹالتی آرہی تھی۔

آج جب پاس پڑوس کی دوسری کوٹھے والیوں نے سنا کہ بیلا بائی نے رجنی کا سودا بڑی توند والے سیٹھ گلاب رائے کے ساتھ طے کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے _____ اُنہیں حیران ہونا ہی چاہیے تھا _____ کیونکہ یہ حور بہ پہلوئے لنگور والا معاملہ بنتا تھا _____ اور یہی کارن رجنی کی اداسی اور غمزدہ ہونے کا بھی تھا۔

رجنی کی نتھ اتاری گئی اور نتھ اتروائی کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی _____ پاس پڑوس _____ دوستوں اور شناساؤں کو ایک پُرتکلف

پارٹی دی گئی۔ رجنی کو دلہن بنایا گیا ______ سیٹھ گلاب رائے کے نذر کئے ہوئے زیورات سے سجایا گیا ______ اُسے خوشبودار پھولوں کی مسہری پر بٹھایا گیا ______ اور پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی ______ کوئی قریب آیا ______ اور رات بھیگتی رہی۔

رجنی کی ماں بیلا بائی اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ اُس نے انگریزی شراب کا ایک بڑا سا پیگ بنایا اور اُسے غٹا غٹ پی لیا۔ پھر وہ ہنسنے لگی ______ زور زور سے ہنستی رہی ______ قہقہے لگائی رہی ______ قہقہے ______ خوب قہقہے ______ زور زور سے ______ اور آخر میں اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کی ایک دھارا بہہ نکلی جو نہ جانے اپنے ساتھ کتنے غم واندوہ کے طوفان بہا کر لے گئی ______ وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑی اور سسکنے لگی۔ دل کا غبار ڈھل جانے کے بعد اُسے ایک قرار سا ملا اور وہ خود کلامی کے انداز سے بولنے لگی۔

"میں رو کیوں رہی ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک سے ہوگیا۔ ہاں! آج بھی میں واقعی خوش ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ اطمینان سے اپنے بستر ے میں لیٹ گئی۔ لگتا تھا جیسے اُس کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ اور رات بھیگتی رہی ______

صبح کو ناشتے کی میز پر بیلا بائی کا انتظار ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ابھی سو کر نہیں اُٹھی تھی۔ جب بہت انتظار ہو چکا اور ناشتہ بھی ٹھنڈا ہونے لگا تو سیٹھ گلاب رائے خود بیلا بائی کے کمرے میں اُسے جگانے گئے۔ اُس نے بیلا بائی کو آوازیں دیں ______ ہلایا جھلایا ______ پر وہ ایک میٹھی اور گہری نیند سو چکی تھی ______ سیٹھ جی پریشان ہو گئے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا

کہ وہ کیا کرے۔ وہ مڑے اور رجنی کو آواز دینا ہی چاہ رہے تھے کہ اُن کی نظر تپائی پر رکھے ایک کھلے کاغذ پر پڑی۔ اُسے اٹھایا اور پڑھنے لگے۔

سیٹھ گلاب رائے!

صبح تم لوگ مجھے اپنے سے دور ـــــ بہت دور اُس جگہ پاؤ گے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ میں نے زہر کھا کر خودکشی کی ہے ـــــ کیوں کی ہے؟ لو تم بھی سنو ـــــ سیٹھ یاد کرو وہ وقت جب تم صرف گلاب چند تھے اور کرشن پورہ میں ایک معمولی دوکاندار تھے۔ تم نے ایک لڑکی ـــــ

آگے سیٹھ گلاب رائے سے کچھ نہ پڑھا گیا، اُسے چکر سا آیا اور وہ غش کھا کر نیچے فرش پر گر پڑے۔

کافی وقت گذر جانے کے بعد جب سیٹھ جی بھی واپس نہ لوٹے تو رجنی بھی اُکتا کر ماں کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئی۔ اُس نے ماں کو خواب شیریں میں اور سیٹھ جی کو فرش پر بے ہوشی کی حالت میں دیکھا۔ سیٹھ جی کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اُس نے معاملے کو سمجھنے کے لیے کاغذ اٹھایا اور اُسے پڑھنے لگی۔

سیٹھ گلاب رائے!

صبح تم لوگ مجھے اپنے سے دور ـــــ بہت دور اُس جگہ پاؤ گے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ میں نے زہر کھا کر خودکشی کی ہے ـــــ کیوں کی ہے ـــــ لو تم بھی سنو۔

سیٹھ یاد کرو وہ وقت جب تم صرف گلاب چند تھے اور کرشن پورہ میں ایک معمولی دوکاندار تھے۔ تم نے ایک لڑکی جس کا نام پارو تھا اپنے دام میں

پھانسا۔ اُسے محبت کا جھانسہ دیا اور اُس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس معصوم، شریف اور بھولی لڑکی نے تم کو اپنا سب کچھ تن من سونپ ڈالا۔ وہ تمہارے جھوٹے پیار میں بغیر کچھ سوچے سمجھے تمہارے پُرفریب راستوں پر آگے ہی آگے کو بڑھتی رہی۔ تم نے اُس لڑکی کے سچے پیار کا خوب صلہ دیا، اچھی قیمت وصول کی۔ پھر جب اُس نے تم کو پیر بھاری ہونے کی خبر دی اور شادی جلد سے جلد کرنے کی منت کی تو تم اُس رات وہاں سے کسی طرف بھاگ نکلے۔ اُس لڑکی کا کچھ نہ سوچا کہ اُس کی کوکھ میں جو بچہ ہے وہ اُس کا کیا کرے گی، کس کا جتائے گی۔ تمہیں اُس معصوم لڑکی پر ترس بھی نہ آیا۔ کتنے خود غرض، مکار اور بزدل بھیڑیئے ہو تم۔

خیر مجھے گڑھے مردے اکھاڑنے نہیں ہیں۔ اُس لڑکی پر پھر کیا بیتی اُسے جانے دو۔ ہاں یہ ضرور سنو کہ اُس بچے کا کیا ہوا جو تمہارا تھا اور اب بھی ہے۔ اتنا ضرور بتاؤں گی کہ وہ پارو بھر بیلا بائی کے مکروہ نام اور پیشے سے مشہور ہوگئی اور وہ بچہ رجنی ______

رجنی کے آج تک کئی دعوے دار اور خریدار سامنے آئے۔ میں اُسے کسی بڑی رقم یا جائیداد کے عوض بھینٹ چڑھا دیتی مگر آج سے تین ماہ قبل جب میں نے تمہیں یہاں آتے دیکھا تو اُسی وقت میرے دل و دماغ نے تم سے انتقام لینے کے لیے اُکسایا۔ تم مجھے پہچان نہ سکے کیونکہ سولہ سال کے سرد و گرم کے علاوہ میرے پیشے نے میرے چہرے کو اس قدر تبدیل کر دیا ہے کہ کوئی سگا بھی مجھے پہچان نہیں پاتا۔ آج میرا انتقام پورا ہوا۔ آج میں بہت خوش ہوں اور آرام سے مر رہی ہوں۔

بدنصیب

پارو

اُسی شام مرگھٹ میں ـــــــــ پاس پاس تین چتائیں ایک ساتھ شعلے اُگل رہی تھیں اور بیلا بائی کا کوٹھا کسی اور بائی کے ہاتھوں کسی اور گلاب رائے کی ہوسناکیوں کے لیے پھر سے آراستہ ہو رہا تھا۔



پاپ لگ جائے گا

ہمیں تنہائیوں میں یوں تو کیا کیا یاد آتا ہے
مگر سچ پوچھئے تو اک چہرہ یاد آتا ہے
(ابو محمد سحرؔ)

پاپ لگ جائے گا

وہ قد کاٹھ سے لمبا تو تھا مگر کچھ ٹیڑھا میڑھا ایک مخنی سا انسان تھا۔ چلتے وقت اُس کے ایک گھٹنے میں خم سا پڑ جاتا تھا اس لیے وہ ایک پیر کو گھسیٹتا ہوا لگتا تھا جس سے اُس کے چلنے میں ایک لنگڑاہٹ سی آتی تھی۔ شاید وہ نقص اُس کا پیدائشی تھا اور لگتا بھی ایسا ہی تھا۔ پچاس پچپن کے درمیان اُس کی عمر لگتی تھی، کپڑے واجبی سے ہوتے تھے مگر سر پر ہمیشہ ہرے یا کیسری رنگ کی ایک پگڑی ہوا کرتی تھی۔ بول چال بھی زیادہ صاف نہ تھی۔ اُس کے منہ سے الفاظ کبھی صاف اور کبھی ٹوٹے پھوٹے نکلتے تھے۔ گھر بار والا اور خاندانی تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی بیوی بچوں والا اور سرکاری ملازمت میں ایک اچھی پوزیشن پر تھا۔ مگر رام جی کا درجہ اُس کے گھر میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ اُس کی جسمانی ساخت ہی ایسی تھی کہ وہ کچھ کرنے یا محنت مشقت والا کوئی کام کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

رام جی کو اپنے بے مقصد اور ناکارہ ہونے کا احساس یقینی طور پر تھا کیونکہ ایسا اس بات سے پتہ لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ چپ چاپ، گم سُم اور بُجھا بجھا سا لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ یا تازگی کبھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اب گھر والوں نے اُس کے ذمہ صرف یہ کام رکھا تھا کہ گھر کے لوگ پوجا پاٹھ سے فارغ ہوتے تو چڑھاوے کے پھول اور دیگر سامگری وغیرہ کو وہ ایک چھوٹی سی ٹوکری میں ڈال کر ندی پر آکر اُسے پانی میں بہا دیتا تھا۔ ندی پر بنے پکے کنکریٹ گھاٹ جنہیں کشمیری زبان میں ''یارہ بل'' یعنی دوستوں سے ملنے کی جگہ کہتے ہیں اُس زمانے میں بڑے آباد ہوا کرتے تھے۔ نہ صرف لڑکے

بالے بلکہ اکثر محلے کی لڑکیاں بھی اپنی سہیلیوں سے ملنے اُن جگہوں پر آیا کرتی تھیں۔ ہمارا بیشتر خالی وقت وہاں پر ہی گذرتا تھا۔ گرمیوں میں نہانا دھونا اور سردیوں میں کنچے کھیلنے کی وہ منفرد جگہیں ہوا کرتی تھیں۔

چونکہ پوجا پاٹھ میں چڑھاوے کی سامگری میں کبھی کبھی اخروٹ بھی ہوا کرتے تھے۔ اس لیے جونہی رام جی اُس سامگری کو ندی بُرد کرتا ہم جھٹ سے پانی میں کود کر اخروٹ نکال کر چٹ کر جاتے تھے۔ سردی کے جن ایام میں کپڑے کھولنے کا موسم نہیں ہوتا تھا اُن دنوں ہمیں اخروٹ بہہ جانے کا افسوس ہوتا تھا۔ ہم جب بہنے والے اخروٹوں پر جھپٹتے تو رام جی بار بار بلکہ ہر بار ہمیں مسکرا کر ڈانٹ پلاتا تھا۔ ''مائیلو (نادانو) کیا کرتے ہو پاپ لگ جائے گا''۔

اب بچپن کے الہڑ پنے کے دنوں میں کون باپ اور پُن کی بات سوچتا ہے اور طاعت و زہد کی طرف دھیان دیتا ہے۔ ہم ندی کے اُس مخصوص جگہ میں کھُردرے سیمنٹ سے بنی سیڑھیوں پر بیٹھ کر انتظار میں رہتے تھے۔ جونہی رام جی پاؤں گھسیٹتا ہوا آتا جو اکثر کیا بلکہ ہر بار سندھیا کال یعنی شام کا وقت ہی ہوتا تھا، ہم کھڑے ہو کر الرٹ ہو جاتے اور رام جی کو معمول کے مطابق چڑانے کے لیے کہتے۔

''رام جی وُٹ اِز دِس''۔ (Ram Ji what is this)

پتہ نہیں وہ انگریزی کے اُس چھوٹے سے جملے کو سمجھتا تھا کہ نہیں۔ مگر ایک میٹھی مسکراہٹ چہرے پر لا کر جواب میں کہتا۔

''ڈون نہ کینہہ'' (اخروٹ نہیں ہے)۔

وہ گھاٹ کی آخری سیڑھی پر جا کر پوجا کی سامگری ندی میں بہا دیتا تھا اور

ہم تیز نظروں سے پانی کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔ اخروٹ ہوا تو نکال لاتے تھے اور نہ ہوا تو پھر شرارت پر ہی اکتفا ہوتا تھا۔

سوال: رام جی وٹ اِز دِس (رام جی یہ کیا ہے؟)

جواب: ڈُون نہ کینہہ (اخروٹ نہیں ہے)۔

یہ کھیل برسوں تک چلتا رہا جب کہ ہم نے بعد میں یہ بات محسوس کی تھی کہ اُس مذاق نے ایک سنجیدہ صورت اختیار کرلی تھی۔ رام جی کی بے کیف زندگی کے وہ چند پل ہمارے ساتھ گذار کر شاید اُس کے لیے بہار لاتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ہنستا تھا اور وہ ہنسی غالباً اُن ہی چند ساعتوں تک محدود ہوا کرتی تھی۔ ہماری چھیڑ چھاڑ اور شرارت کو اُس نے بھی فی الحقیقت اپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیا تھا۔ جب کہ یہ بات بھی دُرست تھی کہ اُس کی اپنی زندگی میں کوئی خوشی، کوئی ہنسی، کوئی بہار نہیں تھی۔

آج کل بر برشاہ ____ بابا دھرم داس روڈ پر موٹر کاریں، میٹاڈار اور دیگر واہن عین اُسی جگہ کے اوپر سے گذرتی ہیں جہاں کبھی ہم رام جی کے ساتھ شرارتیں کیا کرتے تھے۔ ایک زمانہ تھا موجودہ سڑک کے بجائے ایک پتلا سا بنڈ تھا وہی راستہ، وہی سڑک اور وہی گذرگاہ تھی اور وہاں سے چلنے میں دن میں بھی ہول آتا تھا۔ اور بابا دھرم داس مندر کے دروازے کے سامنے سے گذرنے کے لیے شیر کا کلیجہ چاہیے تھا۔ اول تو مندر کے کتوں کا ڈر رہتا تھا۔ دوسرے مندر سے فلور مل تک (آج وہاں پر شاپنگ کمپلیکس ہے) جہاں چار پانچ چناروں کا سایہ دن میں بھی اندھیرا کردیتا تھا ____ کے بارے میں سارے علاقے میں بڑے قصے مشہور تھے۔ اس لیے جن بھوتوں کے خوف سے اور بہت قلیل آمدورفت نے بھی گذرگاہ کو مزید ہیبت ناک اور

پُراسرار بنادیا تھا۔

ایک دن رام جی کے چھوٹے بھائی کی لڑکی کوشلیا رام جی کے ساتھ کہیں سے مگر اُسی راستے سے آ رہی تھی کہ اُس پر مندر کے دوخونخوار کتوں نے حملہ کردیا۔ کوشلیا چیخنے چلانے لگی مگر مندر سے کوئی اُس کی مدد کرنے نہیں نکلا۔ رام جی نے مدافعت کی اور اپنے ناتواں جسم کو ڈھال بنا کر کتوں کے حملے کو روک کر لڑکی کو صاف اُن کے چنگل سے بچالیا۔ لڑکی کو خراش تک نہ آئی مگر خود وہ کافی زخمی ہوا اور پھر اُن زخموں سے جانبر نہ ہوسکا۔ اور اُس طرح سے اُس نے کوشلیا کے بدلے میں اپنی جان نچھاور کردی۔

تب سے آج تک ایک زمانہ بیت گیا۔ رام جی جب بھی یادوں کے جھروکے سے جھانکتے ہیں تو دل ودماغ میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ کانوں میں بازگشت ہوتی ہے ____ لگتا ہے ہم بچے ہیں اور اُسی پرانے انداز سے ہم رام جی کو چھیڑ رہے ہیں: ''رام جی وٹ اِز دِس'' اور وہ تادیبی انداز سے مگر ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں ڈانٹ رہے ہیں۔ ''مائیلو (نادانو) پاپ لگ جائے گا''۔



Raqs-e-Bismil

رقصِ بسمل شہزادہ بسملؔ کے سات افسانوں کا پہلا مجموعہ [illegible] وضاحتی اعتبار سے یہ کہانیاں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو پیش کرتی ہیں۔۔۔ [illegible] سے بھی یہ کہانیاں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ خوش آیند پہلو تو یہ ہے کہ فنکار [illegible] کہانی کہنے کے فن سے واقف ہے، بلکہ ماضی میں ہوئے مختلف تجربات اور اُن کے اسالیب سے بھی وہ روشناس ہیں۔ اس لیے کہیں تو وہ بیانیہ اسلوب اختیار کرتے ہیں تو کہیں ڈرامائی، کہیں وہ خطوط نگاری کے اسلوب کو برتتے ہیں تو کہیں نقاد اور تبصرہ نگار کے تجرباتی اور تحلیلی انداز کو ———

اگرچہ ان کہانیوں میں ان تجربات کی ابتدائی صورت ہی دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ اگر یہ مشق جاری رہتی ہے تو جلد ہی مصنف کی وساطت سے ہمیں اچھی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔

خدا کرے ہماری توقعات پوری ہوں۔

—— پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین

